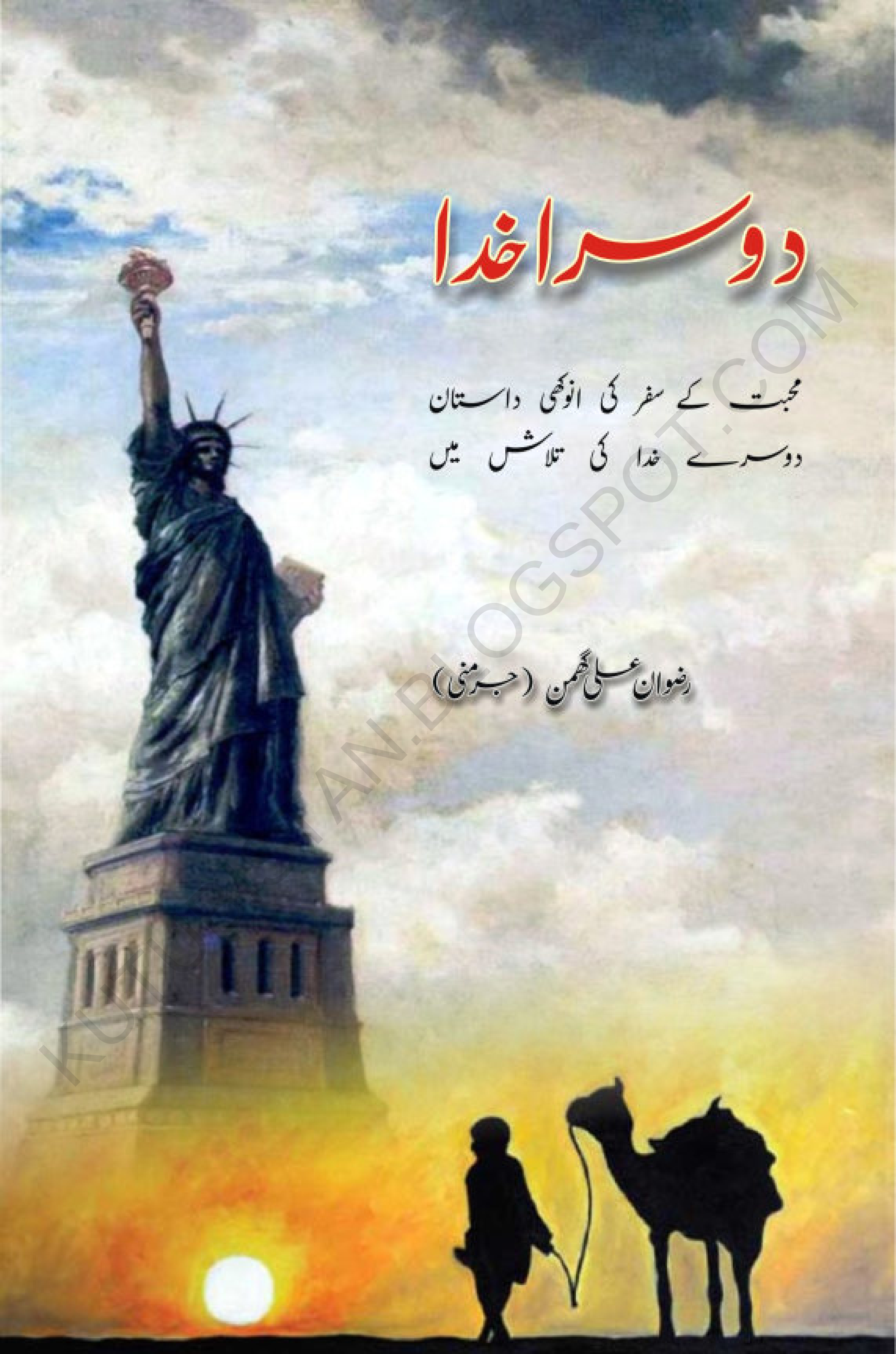

دوسرا خدا
محبت کے سفر کی انوکھی داستان
دوسرے خدا کی تلاش میں
رضوان علی گھمن (جرمنی)

دوسرا خدا

محبت کے سفر کی انوکھی داستان

ایک نئے خدا کی تلاش میں

رضوان علی گھمن (جرمنی)

Whatsapp: *0049-152-11229099*
Facebook: *Rizwan Ali Ghuman*

پیش لفظ

یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے اور نہ ہی اس میں فلموں کی طرح ایکشن ہے۔ یہ کتاب راہِ عشق میں میرے جنون کی داستان ہے۔ ان ہی راہوں پر میری زندگی بھٹکتی رہی اور مجھے مختلف سانچوں میں ڈھالتی رہی۔ میری کہانی پڑھ کر شاید آپ سوچیں کہ نہ جانے یہ رومانی داستان ہے، تاریخ رقم کی ہے یا دیوانوں کو راہ دکھلائی ہے۔ نہیں، بلکہ میں نے اپنے ٹوٹے ہوئے حوصلے کو نئی زندگی دینے کی کوشش کی ہے کہ اب بھی، اور جینے کو کچھ ہے۔

ایسی داستان جو پہلی سطر سے لیکر آخری سطر تک آپ کو کہانی سے جڑے رہنے پر مجبور کر دے گی۔ میں نے عشق کے اس جنون میں ١٦ سال تڑپتے ہوئے گزارے ہیں۔ محبت کتنا درد دیتی ہے اس کا اندازہ تو آپ کو کتاب پڑھ کر ہو ہی جائے گا لیکن اس درد کو سہنے میں جو مزا ہے اس کا اندازہ محبت کرنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ یہ میری طرح کھلی کتاب ہے۔ جو دل میں تھا، سب کچھ لکھ دیا۔

ریگستان کے لق و دق صحرا کی ایک منفرد داستان جو ایک معصوم سے جسمانی تعلق کی خواہش سے شروع ہو کر کامل عشق تک جا پہنچی۔ کہانی میں منفرد انداز اور تجسّس کا ایسا ٹچ ہے جو آپ کو ایک صفحے سے اگلے صفحے تک جانے پر مجبور کرتا رہے گا۔ انفرادیت اور تجسّس کے باوجود یہ کہانی حقیقت سے قریب تر ہے۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں جو افسانوی رنگ کا ہو۔ جو کچھ بھی ہے سچ پر مبنی ہے۔

یہ کہانی آپ کو شہری معاشرے سے دور دیہاتی معاشرے کے ان ڈھکے چھپے گوشوں میں لے جائے گی جن کے متعلق سنا ہوگا، دیکھا نہیں ہوگا۔ یہ کہانی بتائے گی کہ انسان ترقی یافتہ مغرب سے تعلق رکھتا ہو یا ایشیا کے کسی پسماندہ دیہات سے، اس کی فطرت میں محبت کا ازلی جذبہ موجود ہے۔ اس کہانی میں آپ کو خوف و دہشت کی فضا میں محبت جیسے نازک جذبے کی ایک کونپل پھوٹتی نظر آئے گی اور یہ حقیقت بھی ملے گی کہ محبت کا لافانی جذبہ بلاتفریق و بلاامتیاز ہے۔

جیسے کسی انسان کی آخری منزل خدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی کسی بھی کتاب کی آخری منزل اس پر فلمائی جانے والی فلم یا ڈرامہ ہوتی ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ پسند آنے پر اس کتاب کا حوالہ اپنے دوستوں سے شیئر کریں شاید میری اس کتاب کو بھی اپنی اصل منزل مل جائے۔ آپ کی قیمتی آراء کا شکریہ

رضوان علی گھمن (جرمنی)

لکڑی کا بھاری دروازہ ہلکی سی چر چراہٹ کے ساتھ کھلا اور ٹارزن نمودار ہوا۔ اس کا اصل نام تو شاید لکھویندر تھا لیکن ۶ فٹ قد اور تقریباً ۹۰ کلوگرام وزن کے ساتھ وہ انڈیا کا ایک روایتی سکھ سردار تھا جو کسی بھی طور کسی ٹارزن سے کم نہیں تھا۔

بہت تیز بارش ہو رہی تھی اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ دروازے کی ہلکی سی چر چراہٹ بھی میرے کانوں کو پھاڑ کر میرے دماغ میں گھسی چلی آرہی تھی۔ میں ریسٹورنٹ کی عقبی گلی کی دیوار سے ٹیک لگائے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح زمین پر بیٹھا ہوا تھا اور سردیوں کی اس تیز بارش نے مجھے پوری طرح بھگو دیا تھا۔ میرا موبائل مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر پڑا تھا جو بارش کے پانی کے ساتھ اپنی بقا کی جنگ لڑتے لڑتے تقریباً ہار چکا تھا، لیکن میرے ٹھٹھرتے بدن میں ابھی بھی زندگی کے آثار باقی تھے۔

دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رکی ضرور تھی مگر آہستہ آہستہ پھر زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر دیوار کی دوسری طرف ریسٹورنٹ کے اندر زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں تھی۔ کچھ دیر پہلے میں بھی اپنے چہرے پر ایک جھوٹی مسکراہٹ سجائے اسی زندگی کا حصہ تھا۔

ہفتے کی ایک خوبصورت سی شام کارل سروہے (KARLSRUHE) کے اس انڈین ریسٹورنٹ میں بھی اُتری تھی جس میں تمام انڈین سٹاف کے ساتھ میں بھی کام کرتا ہوں۔

بنیادی طور پر میرا تعلق پاکستان کے ریگستانی علاقے بہاولپور سے ہے لیکن اس وقت میں جرمنی میں رہتا ہوں اور ریسٹورنٹ میں ملازمت کرتا ہوں۔ اگر آپ بھی اس انڈین ریسٹورنٹ میں آئیں تو آپ کو سروس پر ایک سیدھا سادھا نوجوان ملے گا۔ ۳۰ سالہ کلین شیو نوجوان جس کے بال سلیقے سے ایک طرف کو کنگھی کیے ہوئے ہیں، وہ نوجوان میں ہوں۔ میں تقریباً ۱۵ ماہ قبل جرمنی آیا تھا اور پچھلے ایک سال سے ویٹر کی جاب کر رہا ہوں۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے ایک ٹیبل سے دوسری ٹیبل، شاید زندگی اسی کا نام ہے۔ محبت سے پیٹ نہیں بھرتا اور پیٹ کی یہی بھوک ہی شاید زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔

آج ویک اینڈ تھا اور دسمبر کے اس ویک اینڈ پر معمول سے زیادہ رش تھا۔ میں گاہکوں کے جانے کے بعد ٹیبل سے خالی برتن اٹھا رہا تھا جب میرے موبائل کی گھنٹی تیسری بار بجی۔

''راضی! فون دیکھ لو شاید کوئی ایمرجنسی کال ہو۔'' میرے مالک نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے باقی بچ جانے والے گلاس اٹھائے اور موبائل پر مسلسل آنے والی وڈیو کال اٹینڈ کی۔ والد محترم کی کال تھی۔

''جی ابو جی!'' میں کچن کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''اسلم فوت ہو گیا یار۔'' ابو نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''جی وہ کب؟'' میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی تھی۔ میرا ذہن ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں چلا گیا۔

اسلم جس کا پورا نام ''محمد اسلم'' تھا۔ ۴ فٹ قد اور ایک ٹانگ سے ہلکا سا لنگڑا کے چلتا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس سے مجھے شدید نفرت تھی۔ یہ وہی اسلم تھا جس پر میں نے ۱۳ سال کی عمر میں گولی چلائی تھی۔ شاید اس کی قسمت اچھی تھی یا میری، جو سینے پر چلائی گئی گولی اس کے کندھے پر لگی اور وہ بال بال بچ گیا تھا۔ آج نجانے کیوں اس کی موت کا بہت افسوس ہو رہا تھا۔

''بیٹا تو ٹھیک تو ہے نا؟'' میری والدہ محترمہ کی آواز تھی جو ابو کے ساتھ ہی کھڑی تھیں۔ میں ماضی کے خیالات سے باہر نکل آیا۔

''جی امی جی! میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے امی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو پتھر کی طرح بالکل سپاٹ ہو چکا تھا۔

آنکھوں کے گرد بڑے بڑے سیاہ حلقے اور سفید بال دوپٹے سے بے نیاز، انہیں وقت کے بے رحم تھپیڑوں نے بہت پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا بلکہ نہیں، انہیں میں نے بوڑھا کر دیا تھا۔ وہ بدنصیب میں ہی تھا جس کی وجہ سے میری ماں نے گلی گلی کی خاک چھانی تھی۔

میں آج بھی جرمنی میں بیٹھا انجلا میرکل کو دعائیں دیتا ہوں جس کی وجہ سے مجھے یہاں گھر بھی ملا اور کام بھی۔ آج میں کچھ پیسے کما کر پاکستان بھیجتا ہوں تو میرے گھر کا چولہا جلتا ہے۔ مجھے جرمن قوم دنیا کی سب سے

مہربان اور محبت کرنے والی قوم لگتی ہے جو ہمیں اپنے گھر میں خوش آمدید بھی کہتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے نوالہ بھی ہمارے منہ میں ڈالتے ہیں۔لیکن جب میں کچھ انتہا پسند لوگوں کو مہاجرین کے خلاف جلوس نکالتے دیکھتا ہوں تو میرے سینے میں درد ہونے لگتا ہے۔خدا نے مجھے اتنی طاقت نہیں دی جو میں آپ کو بتا سکوں کہ زندگی اس جرمن کے باہر کتنی مشکل ہے۔

یہاں جرمن میں کچھ لوگ گرم کمروں سے گرم گرم ناشتہ کر کے گرم کپڑے پہن کر سڑکوں پر نکلتے ہیں۔گلا پھاڑ پھاڑ کر مہاجرین کو ملک سے باہر نکالنے کے نعرے لگاتے ہوئے،کبھی ان مہاجرین کے دلوں میں بھی جھانک کر دیکھ لیں۔خدا نے آپ کو جرمن میں اور مجھے پاکستان میں پیدا کیا۔اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔آپ لوگ شاید بھوک کے لفظ سے بھی نا آشنا ہوں۔موت تو ایک بار ہی آنی ہے۔ایک بڑا دھماکہ اور سب کچھ ختم۔لیکن یہ پیٹ کی بھوک انسان کو بندر کی طرح در در نچاتی ہے۔مہاجرین کے خلاف نعرے لگانے سے پہلے آپ آئیں اور مجھ سے ملیں تو میں شاید آپ کو بتا سکوں کہ زندگی کیا ہے۔

مجھے خدا سے کوئی گلہ نہیں۔ میں نے محبت کی تلاش میں ۱۶ سال گزار دیئے۔ وہ محبت جو صرف ۳۰۰ یورو میں بیچی گئی تھی۔وہ محبت جو ۸ سال کی عمر میں ایک درمیانے قد کے لنگڑاتے ہوئے بوڑھے کو بیچ دی گئی۔

میرے والد کہا کرتے تھے کہ ''بیٹا! زندگی فلموں میں دکھائی دینے والے خوابوں کی طرح نہیں ہوتی بلکہ یہ انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔''

میری تحریر میں شاید اتنی پختگی نہیں جو میں آپ کو زندگی کا فلسفہ سمجھا سکوں۔صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ میری زندگی فیس بک اور یوٹیوب پر اپ لوڈ کئے ہوئے اس جانور کی مانند ہے جو مالک کو دیکھ کر دُم ہلاتا ہے،الٹی سیدھی حرکتیں تو کرتا ہے لیکن اس کی نظر ہمیشہ اس کھانے پر ہوتی ہے جو ویڈیو کے بعد مالک اسے دیتا ہے۔

''بیٹا گھر آ جاؤ!'' میرے ابو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''جی ابو جی، میں کوشش کر رہا ہوں۔شاید پیپر بن جائیں تو میں ایک چکر پاکستان کا لگا لوں گا۔'' میں نے آہستہ آواز میں کہا۔

''بیٹا! جلدی گھر آ جاؤ، میں بہت تھک گئی ہوں۔'' میری امی نے ابو کے کندھے کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''جی امی جی، میں کوشش تو کر رہا ہوں۔'' میں نے موبائل کو اپنے سے تھوڑا دور کر لیا۔ میری آنکھیں بھی نم ہو رہی تھیں۔ بارش زور پکڑ رہی تھی لیکن مجھے بارش میں بھیگنے کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔

''یار ایک بار پاکستان ضرور آ جاؤ! میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ تمہارے گلے لگ کر تم سے معافی مانگوں گا تو شاید تم مجھے معاف کر دو۔'' ابو کی آواز لڑکھڑا گئی تھی اور وہ رونے لگ گئے۔

میرا ضبط ٹوٹ گیا۔ آج پہلی بار میرا باپ رویا تھا۔ سب کچھ اچانک جیسے ختم ہو گیا ہو۔ میں نے اپنی والدہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ عجیب سی خالی خالی آنکھیں میری چہرے کی طرف لگی ہوئی تھیں جن میں جہاں کی حسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔ میری ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ اپنی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے اچانک میرے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا تھا اور میں نیچے زمین پر گرتا چلا گیا۔ موبائل مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر گرا اور میں تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ کچن کے دروازے کے کھلنے کی ہلکی سی آواز اور ٹارزن کا چہرہ، یہ آخری احساس تھا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

لق و دق صحرا کسی دبیز قالین کی طرح زمین پر بچھا ہوا تھا۔ یخ ٹھنڈی ہوا جو بالکل آہستہ آہستہ لہرا رہی تھی۔ آسمان پر چودھویں رات کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ پائل کی چھم چھم کی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

''ایمان!'' میں نے نحیف سی آواز میں اسے پکارا تو وہ چلتے چلتے اچانک رک گئی اور اس نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

مجھ میں اچانک جیسے جان سی آ گئی تھی۔ وہ آج بھی اتنی ہی خوبصورت تھی۔ بہت خوبصورت، نازک سا کتابی چہرہ اور اس پر بڑی بڑی ہلکی سبز آنکھیں۔ وہ اتنی معصوم تھی کہ فرشتے بھی اس کی معصومیت کے آگے شرما جائیں۔

میں نے ریت میں دھنسے ہوئے سر کو اٹھایا اور اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ لیکن میری ٹانگوں نے میرے بدن کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا اور میں دوبارہ ریت پر گر گیا۔

''راضی! ابھی تک مجھے بھولے نہیں؟'' اس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ

میرے پاس آ گئی تھی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے میرا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

''راضی! یہ محبت بہت ظالم چیز ہے، انسان کا سب کچھ چھین لیتی ہے۔'' وہ میرے گالوں کو آہستگی سے سہلا رہی تھی۔

''راضی! محبت میں بہت درد ہوتا ہے۔ ہم انسان اس محبت کو برداشت نہیں کر سکتے، یہ بہت درد دیتی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے نظر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں سے ایک آنسو نکلا اور سیدھا میرے خشک ہوتے ہوئے لبوں پر گرا اور پھسل کر میرے حلق میں اتر گیا۔ وہ ایک آنسو کا قطرہ میرے لیے اس لق ودق صحرا میں کسی آبِ حیات سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک قطرہ ہی میری پوری زندگی کی میراث تھا۔ اس ایک قطرے نے میری پوری زندگی کی پیاس ختم کر دی تھی اور میں پھر سے جی اٹھا تھا۔

''راضی! میں مر جاؤں گی اس درد کو سہتے سہتے، مجھ سے اب یہ درد برداشت نہیں ہوتا۔'' وہ زار و قطار رونے لگ گئی اور میرے چہرے پر اس کے آنسوؤں کی رم جھم، جیسے برسات ہو رہی تھی۔ شاید محبت اسی کو کہتے ہیں۔

یہ وہی محبت ہے جس کے لیے انسان خدا سے بھی لڑ جاتا ہے۔ یہ محبت ہی تو تھی جو مجھے خدا اور اس معاشرے کے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف لڑوا رہی تھی۔ یہ محبت ہی تو تھی جو میں ایک شادی شدہ، دو بچوں کی ماں کے لیے پچھلے دس سال سے یونان اور جرمنی کی خاک چھان رہا ہوں۔

ہاں! وہ شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہے۔ جو ہر رات اپنے شوہر کے بستر پر کسی زندہ لاش کی طرح پڑی ہوتی ہے۔

''راضی! امریکہ نے اس دنیا سے غلامی کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن پھر میری قسمت میں یہ غلامی کیوں لکھی گئی، مجھے کیوں ۳۰۰ یورو کے عوض بیچا گیا؟ راضی! تم کبھی امریکہ سے نفرت مت کرنا۔'' اسے امریکہ سے بہت محبت تھی۔

''راضی! خدا اگر مجھے جنت اور امریکہ میں سے انتخاب کا موقع دے تو میں امریکہ چلی جاؤں گی۔ مجھے

خدا کی بنائی ہوئی جنت سے زیادہ خوبصورت امریکہ لگتا ہے۔''

وہ اَن پڑھ تھی، اسے انگلش بالکل نہیں آتی تھی۔لیکن جب بھی میں کوئی ہالی ووڈ کی فلم لے کر آتا تو وہ اسے کسی عقیدت مند کی طرح زمین پر بیٹھ کر دیکھتی تھی۔اسے فلم کی سٹوری سے کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ بار بار فلم ریوائنڈ کر کے امریکہ کی خوبصورتی کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی تھی۔شاید اس کے امریکہ جانے کے اس پاگل پن نے مجھے بھی امریکہ کا دیوانہ بنا دیا تھا۔اسی لیے مجھے آج بھی امریکہ کا بنایا ہوا ہر اصول اچھا لگتا ہے چاہے وہ مسلمانوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے ان کے بنائے گئے ہر قانون میں اچھائی کا پہلو ہی نظر آتا ہے۔

''راضی!۔۔۔۔۔۔راضی!'' کوئی مجھے پکار رہا تھا۔اچانک میں بے ہوشی کی گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔ وہ میرا مالک تھا۔

''کیا ہوا تمہیں! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''جی! میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

بارش کی وجہ سے میرے کپڑے پوری طرح بھیگ گئے تھے۔ مجھے سہارا دینے کے چکر میں میرا مالک بھی بارش میں بھیگ گیا تھا۔

''سوری پا جی! میرا پاؤں بارش میں پھسل گیا تھا اور گرنے کی وجہ سے شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں ابھی نیچے کپڑے تبدیل کر کے آجاتا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ریسٹورنٹ کے اندر اس وقت بہت رش تھا۔چمچ اور پلیٹوں کے ٹکرانے کی آواز اندر کچن تک آ رہی تھی۔

''رہنے دو یار! کام تو چلتا رہتا ہے۔۔۔تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم آرام کرو اور نیچے جا کر لیٹ جاؤ! کام ہم سنبھال لیں گے۔'' انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور نیچے تہہ خانے کی طرف چل دیا۔

دنیا میں بے لوث اور بے غرض انسان بھی ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال انڈین ریسٹورنٹ کا یہ مالک تھا۔

شاید مجھے اپنی کہانی شروع سے لکھنی چاہیے تھی۔ کہیں آپ لوگ میری تحریر پڑھتے پڑھتے اکتا نہ گئے ہوں۔ کیونکہ یہ کوئی فلمی کہانی نہیں ہے جو ہمیشہ Happy Ending پر ختم ہوتی ہے۔

میری زندگی کا ایک ایک پرت غلامی سے لپٹا ہوا ہے جس میں زندگی کی انتہائی تلخ حقیقتیں ہیں۔ قصہ عجیب وغریب ہو تو اسے پڑھنے میں بھی لطف آتا ہے۔ میری داستان عجیب وغریب تو نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہالی ووڈ فلموں کی طرح ایکشن ہے۔ یہ تو پیار اور محبت کے گرد گھومتی ہوئی ایک سادہ سی داستان ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی محبت کی کہانی ہے جو کامل عشق پر ختم ہوتی ہے۔

میرا پورا نام ''رضوان علی'' ہے۔ گھر والے پیار سے ''نانو'' کہہ کر بلاتے ہیں۔ سارے الٹے سیدھے نام پہلے گھر سے ہی نکلتے ہیں اور پھر باہر پورے گاؤں میں پھیل جاتے ہیں۔ مجھے بھی سب نانو کے نام سے ہی پکارتے تھے۔

پھر میری زندگی میں ''ایمان'' آئی اور وہ مجھے ''راضی'' کہہ کر بلانے لگی۔ اسے نانو نام بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے راضی ہی کہتی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی گھر اور باہر سب مجھے راضی ہی بلانے لگے اور نانو نام لوگوں کے ذہن سے محو ہو گیا۔ ''راضی'' ایمان کا دیا ہوا نام آج بھی میری شخصیت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ آج بھی جب کوئی مجھے راضی کہتا ہے تو مجھے اس کے ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔

میری پیدائش ریگستان کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی لیکن میں نے لاشعور کی پہلی آنکھ سیالکوٹ میں کھولی۔ وہ اس طرح کے جب میں ایک سال کا ہوا تو میرے والدین مجھے ساتھ لے کر ماموں کی شادی پر سیالکوٹ گئے۔ وہاں میں اپنے نانا ابو کو بہت پیارا لگا اور وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ایک سال کی عمر میں میرے والدین مجھے نانا نانی کی گود میں دے کر خالی ہاتھ بہاولپور آ گئے اور میں سیالکوٹ کی گلیوں میں ہی پلنے بڑھنے لگا۔ میرے نانا ابو کی گاؤں میں پانچ ایکڑ زمین تھی جس کے کناروں پر امرود کے درخت لگے ہوئے تھے۔ سیالکوٹ کے ہر گاؤں میں آپ کو امرود، جامن اور انار کے درخت کثرت سے نظر آئیں گے۔

میرے نانا صبح سویرے ڈیرے پر نکل جاتے اور پھر رات کو ہی گھر واپس آتے تھے۔ میں بھی اکثر ان

کے ساتھ ہی چلا جاتا تھا۔ وہ کھیتوں میں کام پر لگ جاتے اور میں سارا سارا دن کبھی ایک درخت پر چڑھتا اور کبھی دوسرے پر، سب سے اونچی ٹہنی پر بیٹھ کر ایسا لگتا تھا جیسے میں ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔

آج ۳۰ سال کی عمر میں بھی مجھے درخت پر چڑھنا اچھا لگتا ہے۔ ادھر ہمارے کیمپ کے پاس جتنے بھی اخروٹ کے درخت ہیں میں ان سب کی چوٹی سر کر چکا ہوں۔ آج بھی جب میں بہت اداس ہو جاتا ہوں تو کسی درخت کی اونچی شاخ پر جا کر بیٹھ جاتا ہوں تو دل کو سکون ملتا ہے۔ اداسی جب ذرا کم ہوتی ہے تو نیچے آ جاتا ہوں۔

چونکہ مجھے نانا نے خصوصی طور پر اپنی بیٹی سے مانگ کر لیا تھا اس لیے وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ گھر میں نانا نانی کے علاوہ میرے دو ماموں اور دو خالائیں بھی تھیں۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ پورا گھر میری معصوم سی کلکاریوں سے گونجتا رہتا تھا۔

ہمارے گھر کے پاس پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ پورے گاؤں کو پینے کے لیے پانی یہیں سے سپلائی ہوتا تھا۔ اس تالاب کے کناروں پر ہری بھری گھاس اُگی ہوئی تھی۔ جب شام کا اندھیرا چھا جاتا تو پتہ نہیں کہاں سے سینکڑوں کی تعداد میں جگنو امڈ آتے تھے۔ میں کھانا کھاتے ہی باہر آ جاتا اور ان جگنوؤں کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ اگر کوئی جگنو میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں اسے گھر لا کر شیشے کے مرتبان میں بند کر دیتا اور مرتبان کو اپنے سرہانے رکھ کر اسے دیکھتے دیکھتے سو جاتا۔ میرے نانا ابو مجھے ہمیشہ اس کام سے منع کرتے تھے مگر میں کبھی باز نہ آیا۔

مجھے اپنے نانا ابو کے گھر میں سب کچھ ملتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں یہاں پر میرا کوئی بھی دوست نہ بن سکا۔ شاید مجھے بہاولپور ہی جانا تھا۔ میری قسمت ریگستان کے اس چھوٹے سے گاؤں میں ہی لکھی گئی تھی، جہاں ہر طرف ریت کی حکمرانی تھی۔ جہاں کوئی جگنو نہیں تھا، کوئی بارش نہیں تھی۔

میری والدہ نے دوبارہ سیالکوٹ آنے میں چار سال لگا دیئے۔ میرے دوسرے ماموں کی شادی میں جب میری ماں سیالکوٹ آئی تو ان کے ساتھ میری چھوٹی بہن بھی تھی جس کی عمر اس وقت تقریباً ۳ سال تھی۔ میں نے جب پہلی بار اپنی بہن کو دیکھا تو وہ مجھے بالکل کسی چینی گڑیا جیسی لگی۔

مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے۔ اس دن میں صبح صبح جلدی اٹھ گیا تھا۔ میری نانی حسبِ معمول دہی میں مدھانی پھیر کر مکھن نکال رہی تھیں اور میں ان کے پاس بیٹھا پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکروں سے کھیل رہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک عورت اپنی ایک سالہ بیٹی کے ساتھ اندر آئی۔

''ثمینہ! میری بیٹی آ گئی۔'' نانی نے مدھانی کو وہیں چھوڑا اور تیزی سے اس عورت کے گلے لگ گئی۔ ذرا سی دیر میں پورے گھر والے اس عورت کے گرد جمع تھے۔

''ریحانہ! جلدی سے چائے بنالو۔'' نانی نے بڑی خالہ کو تھپکی مارتے ہوئے کہا جو اس چھوٹی لڑکی کو گود میں اٹھا چکی تھی اور اسے ہوا میں اچھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''جی امی! بناتی ہوں۔'' اس نے بچی کو نیچے اتارا تو دوسری خالہ نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کو گود میں اٹھالیا۔

''امی! یہ کتنی پیاری ہے۔'' چھوٹی خالہ نے نانی سے کہا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی تھیں اور انہوں نے چھوٹی لڑکی کو اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا۔

''ہاں ثمینہ! کتنی پیاری لڑکی ہے تمہاری۔'' نانی نے ابھی بھی اس عورت کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

''اوئے نانو! ادھر آؤ، دیکھو تمہاری ماں آئی ہے۔'' نانی کو اچانک میری یاد آ گئی۔ میں نے جلدی سے پتھر کے ٹکڑوں کو نیچے پھینکا اور بھاگ کر نانی کے پاس آ گیا۔

''ثمینہ! دیکھو ہمارا نانو کتنا بڑا ہو گیا ہے۔'' نانی نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس عورت کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''نانو پتر! یہ تیری ماں ہے۔''

''امی!'' میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ نیچے زمین پر بیٹھ گئیں اور انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

نو مہینے میں نے اس عورت کے پیٹ میں گزارے اور ایک سال دودھ پیا تھا۔ ۲۱ مہینوں کا یہ ساتھ نانا اور نانی کے گھر میں گزارے گئے چار سالوں سے زیادہ بھاری تھا۔ میری ماں مجھے سینے سے لگائے زار و قطار رو رہی تھی۔ نانا اور نانی کے گھر میں گزرے ہوئے ان چار سالوں میں میں ہزاروں بار نانا نانی اور خالاؤں کے گلے

لگا تھا، خوشی سے مسکراتے ہوئے یا دکھ سے روتے ہوئے میں ہزاروں بار نانی کے گلے لگا تھا۔ مجھے بہت سکون ملتا تھا۔ آج میں پہلی بار اپنی ماں کے گلے لگا تو اتنا سکون مل رہا تھا جو بیان سے باہر ہے۔ خدا نے مائیں شاید اسی لیے بنائی ہیں۔ میری ماں رو رہی تھی اور میرے چہرے کو بار بار چوم رہی تھی۔

''ثمینہ! چھوڑ دے بچے کو، یہ ادھر ہی ہے کہیں بھاگ نہیں رہا، اسے سانس تو لینے دو۔'' نانی نے امی کو خفگی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''جی امی!'' میری ماں نے مجھے بے دلی سے اپنے سینے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ان کا ابھی بھی شاید دل نہیں بھرا تھا۔

''ارم! ادھر آؤ بیٹا۔''

''یہ تمہاری چھوٹی بہن ہے۔'' انہوں نے خالہ سے ارم کو لے کر میرے سامنے کھڑا کر دیا۔

''ارم پتر! یہ تیرا بڑا بھائی ہے۔'' انہوں نے ارم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اس چینی گڑیا میں جیسے جان سی آ گئی اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکنے لگی۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کے چھوٹے چھوٹے دونوں ہاتھ پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے گالوں کو چھونے لگا۔ خدا نے مجھ کو تین بھائی اور ایک بہن دی ہے لیکن مجھے اپنے تینوں بھائیوں میں سے سب سے زیادہ پیار اپنی اس چھوٹی بہن سے تھا۔

بہنیں اپنے بھائیوں کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ اسے بھی اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے زیادہ مجھ سے ہی پیار تھا۔ زندگی میں جب بھی کبھی میں لڑکھڑایا، ارم نے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیا۔ مجھے سہارا دینے کے چکر میں خود اس کے اپنے ہاتھ لہولہان ہو گئے۔ کہتے ہیں بڑی بہن ماں کی طرح ہوتی ہے لیکن میری زندگی میں میری اس چھوٹی بہن نے مجھے ماں بن کر دکھایا۔ زندگی کے ہر موڑ پر اپنے بھائی کا ساتھ دیتے دیتے وہ خود بھی ٹوٹ گئی تھی۔

آج وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں خوش ہے لیکن ماضی کے اس دردناک سفر نے اسے بھی وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ آج وہ بھی ۲۸ سال کی عمر میں اپنے بال سفید کر چکی ہے لیکن وہ کہتی ہے میں خوش

ہوں، شاید وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔

زندگی نے اگر کبھی ساتھ دیا تو اس سے ایک بار معافی ضرور مانگوں گا۔ وہ تو بہت پہلے ہی مجھے معاف کر چکی ہے لیکن پھر بھی میں ایک بار معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ شاید اس سے میری زندگی میں کچھ بہتری آ جائے یا شاید میرے درد میں کچھ کمی ہو جائے اور مجھے راحت مل جائے۔

''نانو بیٹا! اسے بھی اندر لے جاؤ اور دیکھو تمہاری خالہ نے چائے بنا لی ہو گی۔'' نانی نے مجھے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں! اندر بسکٹ بھی پڑے ہوئے ہیں وہ بھی ساتھ میں کھلاؤ اپنی بہن کو۔'' نانی نے مجھے دوبارہ کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی بہن کی انگلی پکڑ کر اسے کچن میں لے آیا۔

تین دن بعد ماموں کی شادی تھی اور امی نے آتے ہی پورے گھر کا انتظام سنبھال لیا۔ شام تک یہ گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ ارم اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی لیکن میں سارا دن اس کے ساتھ ساتھ رہا۔

شادی کے بعد اگلے تین دن بھی بہت مصروف گزرے۔ امی اور نانی اپنے اپنے کاموں میں لگی رہیں لیکن میں نے ایک پل بھی ارم کو اپنے آپ سے جدا نہ کیا۔ اسے بھی مجھ سے انس ہو گیا تھا۔ وہ بھی سارا سارا دن میرے پیچھے پیچھے رہتی تھی۔

''امی! میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا، مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔''

شادی ختم ہو چکی تھی اور امی اپنا سامان باندھ کر واپس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ امی کو آئے ہوئے پورے سات دن ہو گئے تھے۔ سارے کام خوش اسلوبی سے ختم کرنے کے بعد آج امی واپس جا رہی تھی جب میں نے دھماکہ کر دیا۔

''ارے نانو بیٹا! ہم اکٹھے تیرے ماموں اور ممانی کے ساتھ بعد میں جائیں گے۔'' نانی نے مجھے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں نے امی کے ساتھ ہی جانا ہے، مجھے ابھی جانا ہے۔'' میں نے اپنے آپ کو نانی کی گود سے چھڑایا اور بھاگ کر امی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''امی! میں نے آپ کے ساتھ ہی جانا ہے۔'' میں رونے لگ گیا تھا۔

''ابو! میں اسے اپنے ساتھ ہی لے جاتی ہوں۔ دو تین مہینوں کے بعد جب آپ بہاولپور آئیں گے تو اسے واپس لے آنا، تب تک یہ بھی اپنے دوسرے بھائیوں سے مل لے گا۔'' امی نے میرے نانا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! تم اسے لے جاؤ، دو تین مہینوں کے بعد میں اسے لے آؤں گا۔'' نانا نے امی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں جلدی سے اندر کمرے میں گیا اور اپنا سامان باندھنے لگا۔ میری دونوں خالائیں بھی میرا سامان باندھنے میں میری مدد کرنے لگیں۔ اتنی دیر میں باہر تانگہ آ گیا اور ہم جلدی جلدی سب گھر والوں کو گلے ملے اور تانگے میں بیٹھ گئے۔ تانگہ ہمیں لے کر گاؤں سے باہر چل دیا۔

یہ سیالکوٹ کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں میں نے اپنے بچپن کا کچھ حصہ گزارا تھا۔ میں نے صرف تین مہینے کے لیے اس گاؤں کو چھوڑا تھا لیکن پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ زندگی میں صرف ایک بار ایمان کے ساتھ میں اس گاؤں میں آیا ضرور تھا مگر اس وقت اس گاؤں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آج میں ضد کر کے اور رو کر اس گاؤں کو چھوڑ رہا تھا اور جب میں ایمان کے ساتھ اس گاؤں میں آیا تو اس وقت بھی میں رویا، گڑگڑایا لیکن مجھے اس گاؤں نے دھکے مار کر باہر نکال دیا تھا۔

تانگے میں بیٹھ کر ہم پیرو چک آ گئے جہاں سے کوچ میں بیٹھ کر سیالکوٹ اور پھر وہاں سے ہم نے بہاولپور جانے والی بس پکڑ لی۔ دس گھنٹے میں ہمیں بس نے سیالکوٹ سے بہاولپور پہنچا دیا۔

سیالکوٹ اور بہاولپور دونوں شہروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سیالکوٹ ایک سرسبز و شاداب شہر ہے اور یہاں سارا سال بارشیں ہوتی ہیں۔ دنیا کا سب سے بہترین باسمتی چاول یہیں کی پیداوار ہے۔ اس کے برعکس بہاولپور ایک ریگستانی شہر ہے۔ جہاں سال میں کبھی کبھار ایک دو بار ہلکی سی بارش ہو جاتی تھی ورنہ سارا سال

خشک سالی ہی رہتی تھی۔ کہیں کوئی سبزہ یا ہریالی نہیں تھی۔ ہر طرف ریت کے اونچے اونچے پہاڑ اور چہرے کو جھلسا دینے والی تیز ہوائیں چلتی رہتی تھیں۔

اب تو حکومتِ پاکستان نے یہاں پانی کی فراہمی کا بندوبست بھی کر دیا ہے اور بجلی کی سہولت بھی میسر ہے جس سے علاقے میں کچھ ہریالی آ گئی ہے۔ پانی و بجلی کی فراہمی سے یہ علاقہ ترقی کر گیا ہے اور یہاں پر کپاس کی کاشت ہوتی ہے۔ چونکہ کپاس کو کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہاں آپ کو ہر طرف کپاس کے کھیت ہی نظر آئیں گے۔

ہم لوگ صبح صبح بہاولپور پہنچ گئے تھے۔ بہاولپور سے آگے ہم نے کوچ میں سفر کیا جس نے ہمیں گاؤں سے دو کلومیٹر دور اڈے پر اتارا اور گاؤں کی طرف سے گزرنے والی ٹرین کی پٹڑی پر پیدل چلتے چلتے ہم گھر پہنچ گئے۔

امی نے لکڑی کے دروازے کو کھٹکھٹایا، دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک منٹ بعد ہی دروازے کی کنڈی گرنے کی آواز آئی اور ایک نو دس سالہ لڑکے کا چہرہ نظر آیا۔ وہ خوشی سے ''امی'' کہہ کر چلّایا اور امی سے لپٹ گیا۔ وہ میرا بڑا بھائی تھا۔

ہم لوگ دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ اندر صحن میں مٹی کے بنے ہوئے چولہے کے گرد سارے گھر والے اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے اور چائے میں رس ڈبو ڈبو کر کھا رہے تھے۔

دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر، ایک طرف سیمنٹ سے بنی ہوئی سیڑھیاں جو چھت پر جاتی تھیں اور اس کے ساتھ چھوٹا سا برآمدہ۔۔۔ میں نے ایک نظر میں ہی پورے گھر کا جائزہ لے لیا۔ یہ گھر ہمارے سیالکوٹ والے گھر سے بہت چھوٹا تھا، جس میں باتھ روم بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ اگلے چار پانچ سال تک ہم رفع حاجت کے لیے کھیتوں میں جاتے تھے۔ بعد میں ابو نے باتھ روم بنوا لیا اور ایک بیٹھک بھی بنوائی جس میں ہم فصل محفوظ کرنے لگے۔

ہمیں گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر سب گھر والوں نے چائے کی پیالیاں زمین پر رکھیں اور ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ سب بہن بھائی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ دونوں بھائی مجھے اندر کمرے میں لے گئے اور

اپنی کتابیں دکھانے لگے۔ جلد ہی میں بھی ان کے ساتھ گھل مل گیا۔ آنے والے کچھ دنوں میں میرے والد نے مجھے سکول میں داخل کروا دیا اور میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے لگا۔ نئے دوست، نئے رشتے بنانے لگا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے گاؤں میں بجلی نہیں آئی تھی۔ سکول سے گھر آنے کے بعد صبح کی بچی ہوئی روٹی ہم نے درخت کے سائے میں ٹوکرے کے نیچے رکھی ہوتی تھی۔ گھی کے ساتھ چوپڑی ہونے کی وجہ سے وہ سارا دن نرم رہتی تھی۔ ہم لوگ وہی روٹی اچار، دودھ اور بالائی کے ساتھ دوپہر کو کھاتے تھے۔

میرے والد کی چار ایکڑ زمین تھی۔ دو ایکڑ زمین پر وہ جانوروں کا چارہ اور باقی دو ایکڑ پہ سبزیاں بیچتے تھے۔ نانا نانی کے گھر کی طرح یہاں اتنی خوشحالی نہیں تھی مگر پھر بھی گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی۔ ابو نے ڈیرے پر بکریاں اور گائے بھی پالی ہوئی تھیں۔ جن کے دودھ اور گوشت سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم نے گھر میں مرغیاں بھی پالی ہوئی تھیں۔

ابو صبح صبح منہ اندھیرے ڈیرے پر چلے جاتے جہاں پر وہ سب سے پہلے جانوروں کا دودھ دوہتے اور پھر ٹوکری لے کر تازہ سبزیاں توڑنے لگ جاتے۔ وہ دوپہر بارہ بجے تک سبزیاں توڑتے اور پھر ساری سبزیاں اور دودھ لے کر گدھا گاڑی پر لوڈ کرتے اور بیچنے کے لیے منڈی لے جاتے۔

منڈی سے ان کی واپسی تین سے چار بجے تک ہوتی تھی۔ گھر آ کر وہ گدھا گاڑی کو علیحدہ کر کے پانی پلاتے اور پھر ایک ایک کر کے سارے جانوروں کو پانی پلا کر چارہ ڈالتے اور پھر شام ہونے سے پہلے پہلے گھر آ جاتے۔ ہم بھی سکول سے آنے کے بعد ابو کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتے مگر ابو ہمیں منع کر دیتے تھے۔ وہ اَن پڑھ تھے، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن ان کو سبزیوں اور جانوروں کا بہت تجربہ تھا۔ وہ ہمیں سبزیوں کی مختلف اقسام اور ان کی دیکھ بھال کے طریقے بتاتے رہتے۔

چونکہ میں اپنی زندگی کے ابتدائی پانچ سال گھر سے دور رہا تھا اس لیے دوسرے بھائیوں کی نسبت ابو مجھ سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ میں سکول سے چھٹی کر کے جلدی جلدی ڈیرے پر جا کر ابو کی مدد کروانے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے روک دیتے تھے۔ وہ مجھے کام تو سکھاتے تھے لیکن کبھی بھی مجھے زیادہ دیر ڈیرے پر نہ روکتے اور گھر بھیج دیتے تھے۔ جب میں زیادہ ضد کرتا تو وہ مجھے گود میں اٹھا لیتے۔

میرے والد کہا کرتے تھے کہ؛

''میں ان پڑھ ضرور ہوں، کبھی سکول نہیں گیا لیکن مجھے پتہ ہے گھر کیسے چلانا ہے۔ بیٹا! میں چاہتا ہوں تم سکول جاؤ اور خوب دل لگا کر پڑھو تا کہ ایک اچھی زندگی گزار سکو۔ یہ میرا کام ہے اور مجھے پتہ ہے اپنے بچوں کا پیٹ کیسے پالنا ہے۔ تم اس کام کو بھی سیکھو اور سبزیوں اور جانوروں سے محبت کرنا بھی سیکھو۔ ان سے محبت کرو گے تو کبھی بھی بھوکے نہیں مرو گے۔''

اس وقت میں چھوٹا تھا اور مجھے ان کے جملوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ لیکن جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا میں نے بھی ان جانوروں اور سبزیوں سے محبت کرنا سیکھ لیا۔ آپ دنیا کے کسی کونے میں بھی چلے جاؤ اگر آپ کو یہ کام آتا ہے تو آپ کبھی بھی بھوکے نہیں مرو گے۔ میں نے ترکی اور یونان میں یہی کام کیا ہے اور اسی کام سے پیسے اکٹھے کر کے میں جرمنی پہنچا ہوں۔

میں جرمنی میں بے شک ویٹر کا کام کرتا ہوں۔ یہ زمیندارے سے قدرے آسان کام ہے اور اس میں پیسے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک اطمینان تو ہے کہ اگر کل کو یہ کام چھوٹ جائے تو زمیندارے کا کام آسانی سے مل جاتا ہے۔ کام کوئی بھی ہو کرنا تو ہے، کسی کے آگے ہاتھ تو نہیں پھیلاؤں گا۔

اس وقت ہمارے گاؤں میں بجلی یا ٹیلی وژن وغیرہ تو نہیں تھا اس لیے ہم لڑکے سارا سارا دن گھر کے باہر کھیلتے رہتے تھے۔ میں ان کھیلوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ ہر ملک کی اپنی اپنی روایتی گیمز ہوتی ہیں اور ویسے بھی اگر ان گیمز کا تذکرہ کیا گیا تو کہانی بہت لمبی ہو جائے گی۔

ہمارے گاؤں کا ایک نوجوان لڑکا فوج میں بھرتی ہوا۔ اس کا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن ہم سب لوگ اسے فوجی کے نام سے ہی بلاتے تھے۔ وہ دو مہینے کی چھٹی پر گھر آیا تو اپنے ساتھ کرکٹ کا بیٹ اور دو تین بال بھی لے آیا۔ ہمارے گاؤں میں کرکٹ کو متعارف کروانے والا وہی چچا فوجی تھا۔ ہم بچوں کے ہاتھ میں ایک نئی اور جدید گیم آ گئی تھی۔

کرکٹ نے ہمارے گاؤں میں بہت جلدی ترقی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں کرکٹ کھیلنے کے لیے چار پانچ ٹیمیں بن گئیں۔ میں نے بھی اپنے دو بھائیوں اور محلے کے چھ سات لڑکوں کو اکٹھا کیا اور اپنی کپتانی میں

ایک ٹیم تشکیل دے دی۔ ہم سب نے تھوڑے تھوڑے پیسے اکٹھے کیئے اور اپنا کرکٹ کا سامان لے آئے۔

میری کپتانی بمشکل ایک سال ہی چلی تھی کہ میرے بھائی نے قبضہ جما لیا۔ کہتے ہیں کہ حکومت کسی بھی چیز پر ہو، ملک پر یا پھر ۱۰ لڑکوں کی کرکٹ ٹیم پر، حکومت تو حکومت ہی ہوتی ہے۔ انسان اپنے باپ اور بھائیوں تک کو بھی قربان کر دیتا ہے لیکن ہماری کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ اور ویسے بھی وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا اور اس کی گیم بھی مجھ سے اچھی تھی۔ اس لیے جب اس نے کرکٹ ٹیم کی کپتانی مانگی تو میں خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔

آنے والے دو سالوں تک میں ان کی کپتانی میں کھیلتا رہا اور اس کے بعد ہمارے ہمسائیوں کے لڑکے نے کپتانی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ محلے کی کرکٹ کے ابتدائی تین سال میں اور میرا بھائی ہی کپتانی کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ پھر جب کپتانی گھر سے نکلی تو پھر کبھی واپس نہیں آئی۔

میرا چھوٹا بھائی اور دونوں بھتیجے بھی کرکٹ کھیلتے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی کی گیم بہت اچھی ہے لیکن پھر بھی ہم اس کرکٹ کے حکمران نہ بن سکے۔ ہمارے محلے کی کرکٹ ٹیم کا موجودہ کپتان ایک ۲۰ سالہ نوجوان احسان اللہ ہے اور بہت اچھی کرکٹ کھیلتا ہے۔

میرے بچپن کے دن بہت تیزی سے اور بڑے پُرلطف گزر رہے تھے۔ میں نے پرائمری کلاس پاس کی اور گاؤں سے دو کلومیٹر دور اڈے پر واقع ایک ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ ابو نے مجھے سائیکل لے کر دے دی تھی اور میں اسی سائیکل پر سکول جانے لگا۔ میری عمر اس وقت تقریباً ۱۰ سال تھی۔

ہائی سکول میں زندگی پرائمری سکول کی نسبت کافی زیادہ رومانوی تھی۔ اس ہائی سکول کو بیس سے پچیس گاؤں لگتے تھے۔ یہ بہت بڑا سکول تھا اور لڑکے دور دراز کے گاؤں سے یہاں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ سکول میں ایک ہزار سے زیادہ سٹوڈنٹ تھے۔ میں بھی کنویں سے اچانک سمندر میں آ گیا تھا۔

میں بچپن سے نکل کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے لگا تھا۔ چونکہ جوانی چڑھتے ہی صنفِ مخالف کی کشش محسوس ہونے لگتی ہے اس لیے مجھے بھی چاہنا اور چاہے جانا اچھا لگنے لگا تھا، محبت کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔

کہتے ہیں انسان اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتا۔ دو سال میں نے محبت کی تلاش میں گزار دیئے۔ ان دو سالوں میں ہمارے گاؤں میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ بجلی آئی تو اس کے ساتھ ساتھ ٹی وی اور پھر وی سی

آر بھی آ گیا۔ وقت کے تقاضے کے مطابق میرے ابو بھی ٹی وی اور وی سی آر لے آئے۔ گھر میں کچھ خوشحالی آ گئی تھی اور میرے والد نے کچھ پیسے اکٹھے کر کے ایک باتھ روم اور بیٹھک بھی بنوالی تھی۔

ہمارے گھر کے سامنے نمبرداروں کا ایک خالی گھر پڑا ہوا تھا۔ وہاں پر نمبرداروں کا ایک نوکر اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ آ کر رہنے لگا۔ گھر چونکہ خالی تھا اس لیے نمبرداروں نے ہمدردی دکھائی۔ اس کی عمر تقریباً ۵۰ سال سے زیادہ اور قد ۴ فٹ تھا۔ اس کے پاؤں میں پیدائشی تھوڑا سا نقص تھا جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کے چلتا تھا۔ اس کا نام تو ''اسلم'' تھا مگر پورا گاؤں اسے ''لنگڑا'' کہہ کر ہی بلاتا تھا۔

یہ وہی اسلم ہے جس نے میری زندگی پر ان مٹ نشان چھوڑے۔ یہ وہی شخص ہے جس سے میں نے اتنی نفرت کی ہے جس کی شاید ہی کوئی حد ہو۔ یہ وہی شخص ہے جس کے گرد میں اور ایمان گھومتے رہے۔ میری اور ایمان کی زندگی کا محور یہی اسلم تھا اور ایمان اسی کے گھر میں بیاہ کر آئی تھی۔

ہمارے گھر کے سامنے والے گھر میں آئے ہوئے اسے تقریباً چار مہینے ہو گئے تھے جب ایک رات اس کی والدہ فوت ہو گئیں۔ چار مہینے تک دونوں ماں بیٹا گھر کا انتظام سنبھال لیتے تھے لیکن والدہ کی وفات کے بعد وہ رنجیدہ ہو گیا۔ گھر میں کھانا پکانے والا کوئی نہیں تھا۔

غریب اور بوڑھا ہوتا ہوا آدمی۔۔۔ گاؤں والوں کو اس پر ترس آ گیا اور انہوں نے تھوڑے تھوڑے پیسے اکٹھے کئے، کچھ پیسے اس کے پاس بھی تھے۔ کل مل ملا کر تیس ہزار روپے اکٹھے ہوئے جو کہ یہاں (جرمنی) کے حساب سے تین سو یورو بنتے ہیں۔ سرپنچ نے یہ پیسے لیے اور گجرات سے ایک لڑکی لا کر اس کی شادی اسلم سے کر دی۔ سرپنچ نے تیس ہزار روپے ایمان کے والد کے ہاتھ پر رکھے اور اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس بوڑھے کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ تین سو یورو کے عوض ہمارے گاؤں میں آئی تھی۔

آپ کو آج بھی پاکستان میں کچھ ایسے علاقے مل جائیں گے جہاں بیٹیوں کو بیچا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیا مجبوری ہوتی ہے ان والدین کی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بیچ دیتے ہیں۔ ابھی تو ٹی وی اور میڈیا کی وجہ سے تقریباً کنٹرول ہو گیا ہے لیکن میں آج سے تقریباً ۲۰ سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔

مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ وہ اگست کی ایک دلکش شام تھی جب میں بیٹھک کی چھت پر کھڑا

بارات آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''بھائی! بارات کیوں نہیں آئی ابھی تک؟'' میری چھوٹی بہن ارم نے پوچھا۔

''آ جاتی ہے یار! میں بھی تو تمہارے ساتھ ہی کھڑا ہوں۔'' میں نے ارم کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے میرا دماغ کھا رہی تھی۔

''نکاح تو کب کا پڑھایا جا چکا ہے، پتہ نہیں کیوں ابھی تک مسجد سے باہر نہیں نکلے۔'' میرا اتنا کہنا تھا کہ نیچے سے بچوں نے شور مچا دیا کہ بارات آ گئی ہے۔

''نانو! میں تو نیچے جا رہی ہوں، میں نیچے سے ہی دلہن کو دیکھ لوں گی۔'' ارم جلدی جلدی بیٹھک کی چھت سے اتر کر نیچے چلی گئی اور میں چھت پر اکیلا رہ گیا تھا۔

بارات ہمارے گھر کے سامنے آ کر رک گئی تھی۔ لوگوں کے درمیان میں وہ سفید شلوار قمیض پہنے کھڑا تھا اور اس کے گلے میں پیسوں کا ایک ہار بھی تھا۔ اس کے پہلو میں سرخ کپڑوں میں ایک دس گیارہ سال کی لڑکی سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس نے سر پر سرخ رنگ کا ہی دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا اور اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ نیچے بالکل میری نظروں کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ طارق بھائی نے ایمپلی فائر پر نصرت فتح علی خان کی قوالی اونچی آواز میں لگائی ہوئی تھی۔

''میرے رشکِ قمر، تو نے پہلی نظر، جب نظر سے ملائی مزہ آ گیا۔'' نصرت کی اس قوالی میں عجیب سا مزہ آ رہا تھا۔

اچانک کسی عورت کا ہاتھ دلہن کے دوپٹے پر لگا اور دوپٹہ اس کے سر سے سرک کر نیچے گر گیا۔ دلہن نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کو سر کے پیچھے لے جا کر دوپٹہ پکڑا اور دوبارہ سر پہ اوڑھ لیا۔ دوپٹہ اوڑھتے ہوئے اس نے اوپر بیٹھک کی طرف دیکھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں میری نظروں سے مل گئیں۔ وہ اس کی پہلی نظر تھی جو میری نظر سے ملی بس ایک لمحہ اور اس لمحے میں جیسے میری پوری زندگی گزر گئی ہو۔

محبت کا آغاز ہو گیا تھا اور میری تلاش جیسے مکمل ہو گئی ہو۔ وہ دلہن ایمان تھی، میری اپنی ایمان جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ تقریباً دس یا گیارہ سال کی خوبصورت لڑکی جو مجھے پہلی نظر میں بھا گئی تھی۔ وہ میری بہن ارم سے

بھی ایک سال چھوٹی تھی۔

اس کی ابھی شادی کی عمر تو نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ بیاہ دی گئی۔ اسے ۳۰۰ یورو کے عوض بیچا گیا تھا اور وہ چپ سادھے ہمارے گاؤں میں آ گئی۔ اس کی تو ابھی محبت کی بھی عمر نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی اس نے محبت بھی کی اور کسی کو ٹوٹ کر چاہا بھی۔ محبت میں فنا ہونے کا طریقہ اسے بچپن سے ہی آ گیا تھا اس لیے وہ وقت سے بہت پہلے ہی سمجھ دار ہو گئی تھی۔

بارات دروازے پر کچھ دیر رک کر اندر گھر میں چلی گئی تھی۔ باہر گلی میں اب اکّا دکّا بچے ہی رہ گئے تھے۔ میں بھی چھت سے نیچے اتر آیا۔

''یار چلو! بارات والے گھر سے شربت پیتے ہیں، انہوں نے شربت بہت اچھا بنایا ہوا ہے۔'' میرے دوست وحید نے کہا۔ حالانکہ اس سے پہلے ہم دونوں دو دو گلاس شربت کے پی چکے تھے۔

پاکستان میں شادیوں پر اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن اسلم چونکہ ایک غریب آدمی تھا، اس کی ساری جمع پونجی لڑکی خریدنے میں لگ گئی تھی۔ اس لیے اس نے چار پانچ کلو شکّر لی اور اسے سادہ پانی میں ملا کر شربت بنا لیا۔ نمبرداروں کے ڈیرے پر لیموں کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ شربت میں جب لیموں کا رس نکال کر ملایا تو اس کا ذائقہ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ آنے والے سارے مہمانوں کی میزبانی اس نے اسی شربت سے کی۔

وحید مجھے لے کر دوبارہ گھر کے اندر چلا گیا۔ شربت بانٹنے کی ڈیوٹی پر ایک موٹا سا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے گلاس پکڑے اور ڈرتے ڈرتے اس موٹے آدمی کے پاس چلے گئے۔ چونکہ ہم پہلے بھی شربت پی چکے تھے اس لیے ہمیں ڈر تھا کہ کہیں اس کو پتہ نہ چل جائے اور وہ ہمیں شربت پلانے سے انکار نہ کر دے۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور اس نے دوسری بار بھی ہمیں شربت کے دو گلاس دے دیئے۔ میں اور وحید ادھر ہی کھڑے ہو کر شربت پینے لگے۔

''یار چلو! اندر چل کر دلہن دیکھتے ہیں۔'' مجھے دلہن کا دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ وہ مجھے پہلی نظر میں ہی بہت پیاری لگی تھی۔

''یار! تم کوئی لڑکی ہو جو تمہیں دلہن دیکھنے کا شوق ہو رہا ہے؟'' وحید نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ یہ حقیقت ہے کہ دلہن دیکھنے کا شوق لڑکیوں کو ہی ہوتا ہے۔ میں بھی ارم کی وجہ سے چھت پر کھڑا تھا۔ اسے دلہن دیکھنے کا بہت شوق ہوتا تھا۔

''نہیں یار! ایک بار اندر نظر مار لیتے ہیں، بس ایک منٹ! پھر ہم چلے جائیں گے۔'' میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا مگر وہ نہیں مانا۔ اس نے اپنا بازو چھڑوایا اور گھر سے باہر نکلا اور اپنے گھر چلا گیا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے کمرے میں جانے کا سوچا لیکن پھر اپنا ارادہ ملتوی کر کے گھر سے باہر نکل گیا۔ اندھیرا چھا رہا تھا، میں بھی دس پندرہ منٹ بازار میں آوارہ گردی کرتا رہا اور پھر گھر کو چل دیا۔

''رضوان بیٹا! ارم ابھی تک نہیں آئی۔ وہ پاگل ابھی بھی شادی والے گھر میں ہی ہوگی۔ تم جلدی سے جاؤ اور اسے لے آؤ۔ رات کافی ہوگئی ہے، تمہارے ابو ناراض ہوں گے۔'' امی پریشان ہو رہی تھیں۔ میں جلدی جلدی دوبارہ شادی والے گھر چلا گیا۔

''ارم کی بچی! تم ابھی تک ادھر ہی بیٹھی ہوئی ہو؟ گھر میں امی پریشان ہو رہی ہیں۔ چلو اٹھو! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' اندر کمرے میں ارم دلہن کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے کان میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔

کمرے میں دس بارہ عورتیں اور بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ چونکہ ارم اس کی ہم عمر تھی اس لیے وہ اس کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ ارم ویسے بھی بہت شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ ہم تین بھائیوں کی وہ اکیلی بہن تھی اور ہم سب بھائی اس کے ناز بھی بہت اٹھاتے تھے اس لیے وہ بہت شرارتی ہوگئی تھی۔

''جی بھائی! بس ابھی آتی ہوں۔ تم ایک منٹ ٹھہرو۔'' اس نے اپنی سرگوشیوں میں تھوڑا وقفہ کیا تو دلہن نے ایک بار پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ یہ دوسری نظر تھی جو بہت طویل ہوگئی۔ وہ بڑی دیر تک میرے چہرے پر نظریں جمائے مجھے گھورتی رہی۔

اس کی نظریں مسلسل مجھ پر مرکوز تھیں اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی جھلک رہی تھی۔ اس خزاں رسیدہ درخت جیسی اداسی جس کے سارے پتے ٹھنڈی یخ ہوا نے گرا دیئے ہوتے ہیں۔ جس کا کھوکھلا تنا دسمبر کے اس برف زدہ موسم کا مقابلہ کرتے کرتے تھک چکا ہوتا ہے۔ کسی بھی پل زمین بوس ہونے والے اس درخت جیسی

اداسی اس کی آنکھوں میں تھی۔اتنی اداس آنکھوں کے ساتھ بھی وہ خوبصورتی کا ایک عملی شاہکار لگ رہی تھی۔

خدا جب کسی کو بنانے پر آتا ہے تو ایسے ہی شاہکار اس کے ہاتھوں سے نکلتے ہیں۔وہ بھی خوبصورتی کا ایک لامتناہی سمندر تھی۔اسلم ۳۰۰ یورو میں اس کی پوری کائنات خرید لایا تھا اور اسی کائنات کے لیے میں نے اپنی پوری زندگی قربان کر دی تھی۔میں نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائی سب کچھ اسی کے لیے تو قربان کر دیئے تھے لیکن پھر بھی خالی ہاتھ رہا۔کیونکہ میں کاسے میں سمندر کی بھیک مانگ رہا تھا۔

''رضوان بھائی چلو! کدھر کھو گئے ہو، گھر نہیں جانا؟'' ارم نے مجھے بازو سے پکڑ کر ہلایا تو میری نظریں اس کی نظروں سے علیحدہ ہو گئیں اور اس نے ایک بار پھر اپنے سر کو جھکا لیا۔

''ہاں ہاں چلو! جلدی چلو! امی گھر میں ناراض ہو رہی ہیں۔'' میں نے ارم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ایمان! میں کل صبح پھر آؤں گی اور ہم ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔'' ارم نے ایک ہاتھ سے ایمان کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''جی!'' ایمان نے ایک پل کے لیے سر اٹھایا اور پھر جھکا لیا۔ایک آنسو کا قطرہ اس کی آنکھوں سے نکلا اور اس کے گالوں کو چھوتا ہوا گود میں گر کر غائب ہو گیا۔

آنے والی سیاہ رات کی ہولناکی کا خوف اس کے چہرے پر ثبت ہو گیا تھا۔اس سیاہ رات کو اس کا بچپن ایک شادی شدہ مکمل عورت میں بدلنا تھا جسے دنیا سہاگ رات کے نام سے یاد کرتی ہے۔میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ارم کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

''بھائی! جلدی اٹھو نا، ابھی تک سو رہے ہو! ہمیں ایمان کے گھر بھی جانا ہے، وہ لوگ اٹھ گئے ہیں۔'' ارم مجھے جگانے کے لیے صبح سے تین چار چکر لگا چکی تھی۔

یورپی ممالک میں عورت کو آزادی حاصل ہے کہ وہ بغیر کسی مرد کے گھر سے باہر جا سکتی ہے۔کچھ لوگوں کو شاید یہ چیز معیوب لگے لیکن میرا تعلق پاکستان کے جس علاقے سے ہے وہاں آج بھی عورت بغیر کسی مرد کے گھر سے اکیلی نہیں نکلتی۔ایمان کا گھر ہمارے گھر کے سامنے تھا لیکن پھر بھی ارم میرے ساتھ ہی ان کے گھر جاتی تھی۔

آج چھٹی تھی، تینوں بھائی کرکٹ کھیلنے چلے گئے تھے اور ابو ڈیرے پر چلے گئے تھے۔ گھر میں امی، ارم اور میں ہم تینوں ہی تھے۔ چھٹی والے دن ابو بھی زیادہ سونے سے منع نہیں کرتے تھے۔ رات کو میں دیر تک فلم دیکھتا رہا تھا اس لیے ابھی بھی بہت نیند آرہی تھی۔ ارم بار بار آکر مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر کار میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ابھی ایک اچھا سا پراٹھا لگاؤ، ناشتہ کر کے چلتے ہیں۔'' میں نے باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''بھائی! امی نے پراٹھے بنا دیئے ہیں۔ آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھولو۔'' ارم نے پیچھے سے آواز دی تو میرے دل میں شرارت آگئی۔

''جی نہیں! میں نے پراٹھا اپنی چینی گڑیا کے ہاتھ کا ہی کھانا ہے۔'' میں نے شرارت سے کہا تو وہ آنکھیں جھپکنے لگی۔

گھر میں سب اسے ارم کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ صرف میں ہی اسے کبھی کبھی چینی گڑیا کہا کرتا تھا۔ اسے اپنا یہ نام بہت پسند تھا لیکن وہ کسی اور کو یہ نام نہیں پکارنے دیتی تھی۔ کوئی اور اسے اس نام سے پکارتا تو وہ غصہ کرتی تھی۔

''چینی گڑیا کہنے کا حق صرف میرے رضوان بھائی کو ہے۔'' وہ اکثر کہتی تھی اور اگر کوئی اور کہتا تو اس سے لڑ پڑتی تھی۔

''بھائی پلیز! ہم لیٹ ہو رہے ہیں، دوپہر کو میں ضرور آپ کے لیے اچھا سا پراٹھا بنا دوں گی۔'' اس نے معصوم سی شکل بنائی تو میری بے اختیار ہنسی نکل گئی۔

باتھ روم سے نکل کر میں نے ناشتہ کیا اور ارم کو ساتھ لے کر ایمان کے گھر چلا گیا۔ یہاں شادی کی رونق ابھی بھی باقی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں ہر طرف ایک وحشت سی پھیلی ہوئی تھی۔ شاید یہ وحشت میری آنکھوں میں تھی جو مجھے اس گھر میں نظر آرہی تھی۔

''ادھر بھائی! وہ کمرے میں بیٹھی ہوگی۔'' ارم مجھے بازو سے پکڑ کر اندر کمرے میں لے گئی۔

کمرے میں صرف دو تین عورتیں ہی تھیں۔سامنے چارپائی پر ایمان بیٹھی ہوئی تھی۔رات والا سرخ جوڑا اس نے اتار دیا تھا اور اب ہلکے سبز رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے بیٹھی تھی۔سر پر اسی رنگ کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا اور چہرے پر ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔

اس زمانے میں میک اپ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔تبّت کریم لگا کر پہلے چہرے کو اچھی طرح رگڑا جاتا تھا پھر اس کے بعد پاؤڈر لگا کر چہرے کو سفید کرتے اور پھر آنکھوں میں کاجل اور سرخ رنگ کی لپ اسٹک، بس یہی میک اپ ہوتا تھا۔ایمان نے بھی ایسا میک اپ کیا ہوا تھا۔

ایمان کا چہرہ ویسے ہی قدرتی طور پر بہت سفید تھا۔پاؤڈر نے اس کو انتہا تک پہنچا دیا تھا اور اس کے ساتھ سرخ لپ اسٹک، وہ خوبصورتی کا ایک عملی شاہکار لگ رہی تھی۔

''ایمان! کیسی ہو؟ بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' ارم ایمان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی تھی۔

''بہت خوبصورت کپڑے پہنے ہیں تم نے!'' ارم اس کے کپڑے دیکھنے لگی۔

''ایمان تمہاری چوڑیاں بھی بہت پیاری ہیں۔'' ارم اس کی کلائی اپنی گود میں رکھے چوڑیوں سے کھیلنے لگی۔وہ بہت بولتی تھی اور گھر میں بھی ہم سب کے کان کھاتی رہتی تھی۔

''ایمان! قسم سے تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔'' وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ایمان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''ارم!'' ایمان نے اپنا ہاتھ ارم کے چہرے سے ہٹایا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں ارم کے ہاتھ تھام لیے اور ارم کو لے کر کھڑی ہو گئی تھی۔وہ ارم کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''میں خوش نہیں ہوں!'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔

''میں خوش نہیں ہوں!'' اس نے ارم کے ہاتھ چھوڑے اور نیچے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''میں خوش نہیں ہوں!'' اس نے ایک بار پھر سر اٹھا کر کہا لیکن اس بار مخاطب میری بہن نہیں بلکہ اس کے پیچھے کھڑا میں تھا۔

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے ڈھلک پڑے تھے۔ وہ رو رہی تھی ۔ قیامت آئی اور گزر گئی۔ شاید کسی اور کو اس کا احساس نہ ہوا ہو لیکن میں اس قیامت سے گزر گیا تھا۔ بے شک اس وقت میری عمر صرف ۱۲ سال تھی لیکن پھر بھی مجھے سب چیزوں کا پتہ تھا۔

گزری ہوئی رات کے درد کی داستان اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی ۔اس ایک رات کی درندگی نے اس کا بچپن اس کی معصومیت چھین لی تھی ۔ یہ کیسی سہاگ رات تھی جس میں ایک معصوم سی بچی اپنا بچپن کھو بیٹھی تھی ۔

''ایمان ! کیا ہوا،تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' ارم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

'' کچھ نہیں ! کچھ نہیں ، ابھی چھوٹی بچی ہے نا اس لیے ماں باپ کی یاد آ گئی ہوگی ۔ دو تین دن تک اداس رہے گی پھر ٹھیک ہو جائے گی ۔'' کمرے میں موجود باقی عورتوں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور وہ ایمان کو تسلی دینے لگیں ۔

یہ شادی والا گھر تھا لیکن اس کمرے میں موجود اداسی بتا رہی تھی جیسے یہ کوئی مرگ والا گھر ہو۔شاید کسی کے ارمان مر گئے تھے ۔ارم ابھی چھوٹی تھی اسے ان باتوں کا نہیں پتہ تھا اس لیے ارم کے علاوہ یہاں موجود ہر شخص کو پتہ تھا کہ یہ ماں باپ سے بچھڑنے کا دکھ نہیں ہے بلکہ کسی اور چیز کا دکھ ہے۔

کچھ لوگوں کو شاید اس دکھ کا صحیح احساس نہ ہو۔شاید کچھ لوگ میری الفاظ کی گہرائیوں کو نہ چھو سکیں لیکن الفاظ کے ہیر پھیر سے درد کی گہرائیاں نہیں بدلتیں ۔اس کا صحیح احساس صرف انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو اس درد سے گزر چکے ہیں ۔ہم لوگ بھی ایمان کے درد کو سمجھتے تھے لیکن مجبور تھے ۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا اور ہم چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے ۔

میرے والد کہا کرتے تھے ؛

''بیٹا ہر آدمی کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں اور ہر شخص اپنے اپنے دائرے میں صحیح ہوتا ہے ۔ اس دائرے سے باہر ہمیں سب کچھ غلط لگتا ہے ۔لیکن یقین کرو میرے بیٹے ! ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہوتا ہے ۔ یہ مجبوریاں ہی ہوتی ہیں جو ہمیں ہر وقت نچاتی رہتی ہیں ۔''

اس وقت ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن آج اتنے سالوں بعد مجھے ان کی کہی ہوئی ساری

باتیں سچی لگتی ہیں۔ میں، ایمان اور اس کا بوڑھا شوہر اسلم ہم سب ہی صحیح تھے۔ اپنی اپنی جگہ ہم تینوں ہی مجبور تھے اور خدا نے ہم تینوں کی زندگیوں کو ایک دوسرے میں الجھا دیا تھا۔

محبت تو شاید اسلم نے بھی کی تھی کیونکہ محبت میں مذہب اور امیری غریبی نہیں دیکھی جاتی۔ مسلم غیر مسلم کا تصور محبت میں نہیں ہوتا تو پھر ایک بوڑھا آدمی ایک لڑکی سے محبت کیوں نہیں کر سکتا؟ محبت تو اس نے بھی کی تھی۔ خدا نے میری اور ایمان کی زندگیوں کو بہت زیادہ الجھا دیا تھا۔ مجھے ایمان سے محبت تھی۔ مجھے ایمان سے عشق تھا۔ میں اور ایمان ایک دوسرے بے حد محبت کرتے تھے۔ خدا نے ہم دونوں کی محبت میں چھوٹی سی اسلم کی محبت بھی ڈال دی تھی، محبت تو اسلم نے بھی کی تھی۔ اس سبز آنکھوں والی لڑکی کے ہم دونوں ہی دیوانے تھے۔ فنا کے اس سفر پر چلتے چلتے محبت تو اس کو بھی ہو گئی تھی۔

ارم ایمان کے گلے لگ کر رو رہی تھی۔ لڑکیوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں، انہیں ہلکی سی ٹھیس لگتی ہے تو یہ ٹوٹ جاتی ہیں۔ ایمان نے روتے روتے ارم کو بھی رلا دیا تھا۔

''اوئے ہوئے! ہماری ارم بیٹی آئی ہے، اسے کس نے رلایا ہے بھائی؟'' کمرے میں اسلم داخل ہوا۔

اس نے کالی شلوار اور سفید کرتا پہنا ہوا تھا۔ کالے سیاہ بال جو تیل میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس نے سفید بالوں کو کلر سے کالا کیا ہوا تھا۔ بڑی بڑی کالی سیاہ مونچھیں، اس کے چہرے پر شیطانیت برس رہی تھی۔ اس نے آرام سے ارم کو بازو سے پکڑا اور اسے ایمان سے علیحدہ کر دیا۔

''کیا ہوا میری ارم بیٹی کو؟'' وہ ارم سے پوچھنے لگا۔

مجھے اس کے چہرے پر ایک بھیڑیئے کا چہرہ نظر آنے لگا اور اس سے نفرت ہونے لگی۔ یہ کیسا مرد ہے جو ساری رات ایک آٹھ سال کی بچی کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھاتا رہا اور اپنی مردانگی کا زور ایک آٹھ سالہ بچی پر لگاتا رہا اور وہ اس کی ہم عمر دوسری لڑکی کو بیٹی کہہ رہا تھا۔ خدا نے اس دنیا میں مرد سے زیادہ شاید کوئی چیز ظالم نہیں بنائی۔ میں ارم کا بھائی تھا اور بھائی بہنوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ میں ارم اور اسلم کے درمیان میں کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا بیٹے؟'' اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے باپ کی عمر کا تھا اس لیے مجھے

بیٹا اور میں اسے چچا کہہ کر بلاتا تھا۔

''کچھ نہیں چچا! ہم نے گھر جانا ہے۔''

''چلو ارم! طارق بھائی چلے گئے ہیں مجھے بھی کرکٹ کھیلنے جانا ہے۔'' میں نے ارم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی! ابھی چلتے ہیں۔'' اس نے ایمان کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ رونے سے اس کا دل ہلکا ہو گیا تھا اور وہ اب چپ ہو گئی تھی۔

''میں دوپہر کو پھر آؤں گی۔ تمہیں پراٹھے پسند ہیں نا؟ کھاؤ گی نا؟'' وہ ایمان کو پراٹھوں کی دعوت دینے لگی۔

''ہاں ہاں! پراٹھے کھائے گی۔ کیوں نہیں، بلکہ تم اسے اپنے گھر لے جانا اس کا تھوڑا دل بھی لگ جائے گا اور یہ تمہارا گھر بھی دیکھ لے گی۔'' اسلم نے ارم سے کہا تو وہ خوش ہو گئی۔

''چچا آپ بہت اچھے ہو!'' ارم خوش ہو کر اسلم کی طرف لپکی مگر میں نے اسے درمیان سے ہی اچک لیا۔

''چلو گھر، مجھے کرکٹ بھی کھیلنی ہے۔'' پتہ نہیں کیوں مجھے ارم کا اس کے پاس جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، چلو! مجھے بھی آلو ابالنے ہیں اور آلو والے پراٹھے بنانے ہیں۔ ٹھیک ہے ایمان! میں چلتی ہوں۔ ہم سامنے والے گھر میں رہتے ہیں، میں تمہیں اپنا گھر بھی دکھاؤں گی۔'' ارم نے ایمان کو کہا اور ہم گھر واپس آ گئے۔

گھر آ کر میں جلدی جلدی ٹریک سوٹ پہننے لگا۔ تیار ہو کر میں نے بوٹ پہنے اور کھڑا ہو گیا۔ ارم ایک بار پھر میرے سر پر کھڑی تھی۔

''بھائی! آلو ختم ہو گئے ہیں، آپ آلو لا کر دے دو۔''

''کیا آلو ختم ہو گئے؟ تم آلو کے بغیر ہی پراٹھے بنا دو۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

آلو لانے کا مطلب اپنی چھٹی والے دن کا ستیاناس کرنا تھا۔ ہمارا ڈیرہ گاؤں سے تھوڑا ہٹ کر تھا اور

آنے جانے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابو کبھی بھی کھیت سے آلو نکال کر نہیں دیتے، کھیت سے آلو بھی مجھے خود ہی نکالنے پڑتے۔ بیلچے سے زمین کھود کھود کر آلو نکالنا کافی مشکل کام تھا۔

''بھائی پلیز! ایمان پہلی بار ہمارے گھر آئے گی۔آپ آلو لا دو نا!'' ارم معصوم سے لہجے میں میری منتیں کر رہی تھی لیکن آلو لانے کے خیال سے ہی میری جان نکل رہی تھی۔

''رضوان بیٹا! لا دو نا آلو، دیکھو تمہاری بہن کیسے منتیں کر رہی ہے۔'' امی نے بھی ارم کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

''امی! آپ کوئی اور چیز بنا لو نا! کوئی میٹھی چیز بنا لو۔'' میں نے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا! تمہاری بہن ضد کر رہی ہے تو اس کی بات مان لو۔ ایمان پہلی بار ہمارے گھر آ رہی ہے۔ تمہاری بہن کا شوق ہے تو اسے لا دو۔'' امی ایک بار پھر مجھے فورس کرنے لگی تو میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

خاموشی سے ٹریک سوٹ اتارا، کام والے کپڑے پہنے اور ڈیرے کی طرف چل دیا۔ دو گھنٹے بعد میری ڈیرے سے واپسی ہوئی۔ میں نے آلو لا کر ارم کو دیئے اور نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ میرے دوسرے بھائی ابھی تک کرکٹ کھیل کر واپس نہیں آئے تھے۔ نہا دھو کر میں باہر نکلا تو ارم نے آلو ابالنے کے لیے رکھ دیئے تھے اور رائتہ بنا رہی تھی۔ امی نے دودھ میں تھوڑے سے چاول ڈال کر کھیر بنا لی تھی۔

''امی تھوڑے سے سموسے بھی نا بنا لوں؟'' ارم نے پیاز چھیلتے ہوئے کہا تو امی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بھائی! آپ اندر سے میدہ لا دو، میں سموسے کے لیے آٹا گوندھ دیتی ہوں۔'' ارم نے مجھے آواز لگائی۔

گھر میں اچھی خاصی دعوت کا سماں ہو گیا تھا۔ میدہ لا کر میں بھی ارم کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس کی مدد کرنے لگا۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہم نے سب کچھ تیار کر لیا تھا۔

''بھائی! آپ جا کر ایمان کو لے آؤ۔'' ارم نے مجھ سے کہا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایک منٹ بیٹا! اسلم کے لیے کچھ کھانا لے جاؤ۔'' امی نے دو پراٹھے اور تھوڑی سی کھیر مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''جی امی! میں لے جاتا ہوں۔'' میں نے امی کے ہاتھ سے کھانے کا لفافہ پکڑا اور گھر سے باہر آ گیا۔ سامنے ہی ان کا گھر تھا، میں نے گلی کراس کی اور ان کے دروازے پر دستک دینے لگا۔

''آ جاؤ! دروازہ کھلا ہے۔'' اندر سے آواز آئی تو میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

سامنے گھر کے صحن میں چارپائی پر بنیان پہنے اسلم بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا اور ایمان چائے کی دیگچی چولہے پر رکھے چائے بنا رہی تھی۔ لکڑیاں شاید گیلی تھیں اس لیے آگ صحیح جل نہیں رہی تھی اور وہ چولہے میں پھونکیں مار مار کر انہیں جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دھوئیں کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

''چچا! امی نے آپ کے لیے کھانا بھیجا ہے، وہ ایمان کو بلا رہی ہیں۔'' میں نے کھانے کا سامان چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! یہ چائے بنا لیتی ہے تو تم اسے اپنے ساتھ گھر لے جانا۔'' اس نے کھانے کا لفافہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ایمان! جلدی سے چائے بنا دو اس کے بعد رضوان کے ساتھ چلی جانا، ارم تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔'' اس نے ایمان سے کہا تو وہ جلدی جلدی چولہے میں پھونکیں مارنے لگی۔ لکڑیاں صحیح جل نہیں رہی تھیں۔

''چچا! میں ایمان کی مدد کرتا ہوں، گھر میں سارے انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے اسلم سے کہا اور دیوار کے ساتھ بنے ہوئے چولہے کی طرف بڑھ گیا۔

''ایمان! مجھے پھونکنی دو! میں آگ جلاتا ہوں، تم چائے کو دیکھو۔'' میں چولہے کی دوسری طرف بیٹھ گیا۔ ایمان نے خاموشی سے پھونکنی میری طرف بڑھا دی۔

اسلم چارپائی پر بیٹھا لفافے سے پراٹھے نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ میں نے پھونکنی لیتے ہوئے اپنے ہاتھ کی

انگلی ایمان کے ہاتھ سے ٹچ کر دی۔ اس نے گھبراہٹ میں میری طرف دیکھا اور جلدی سے اپنے سر کو جھکا لیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے ہاتھ کو چھوا تھا اور اب میرا دل اندر سے گھبرا رہا تھا۔ اگر ایمان نے شور مچا دیا تو یہاں سے بھی مار پڑتی اور گھر میں ابو کے ہاتھ سے جو حال ہوتا وہ سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

یورپی ممالک میں یہ چیزیں عام ہیں۔ یہاں عورت اور مرد ایک دوسرے سے ملتے ہیں، ہاتھ سے ہاتھ ملاتے ہیں۔لیکن ہمارے ہاں پاکستان میں مرد اور عورت کے درمیان ایک فاصلہ ہوتا ہے۔ یہاں مرد اور عورت کے درمیان دوستی کا کوئی تصور نہیں ہے۔

ایمان اسلم کی بیوی تھی۔ میں اگر ایمان پر لائین مارتے ہوئے پکڑا جاتا تو سارا گاؤں مجھے جوتے مارتا اور میرا والد شاید مجھے گھر سے ہی نکال دیتا۔لیکن جوانی تو ہر ایک پر آتی ہے۔عورت چیز ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ مرد عورت کے لیے ہر قسم کا خطرہ مول لے لیتا ہے۔میں بھی اس لڑکی کے لیے خطرہ مول لے رہا تھا۔

اگلے ایک منٹ تک میں ڈرتا رہا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ایمان مزید کچھ سمٹ گئی تھی۔ میں جلدی جلدی چولہے میں پھونکیں مارنے لگا۔ دو چار منٹ تک چائے تیار ہو گئی تو ایمان نے اسے چھان کر کپ میں ڈالا اور جا کر اسلم کو دے دیا۔اتنی دیر میں میں نے چائے کی دیگچی دھو کر واپس رکھی تو ایمان حیرانگی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

پاکستانی معاشرے میں گھر کا سارا کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔مرد کما کر لاتا ہے اور عورتیں گھر میں بیٹھ کر کھانا بناتی ہیں اور دوسرے گھریلو امور سرانجام دیتی ہیں۔ مرد چاہے چھوٹا لڑکا ہی کیوں نہ ہو وہ کبھی گھر کا کام نہیں کرتا۔ ہماری مائیں اور بہنیں ہی سارے گھر کے کاموں کو سنبھالتی ہیں۔ اب تو ہمارے معاشرے نے کافی ترقی کر لی ہے اور مرد بھی گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔لیکن ماضی قریب تک اس کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ میں ان چیزوں کو نہیں مانتا تھا۔ میرے تینوں بھائی کبھی بھی گھر کا کام نہیں کرتے تھے مگر میں اپنے گھر کے کاموں میں امی اور بہن کا ہاتھ بٹاتا رہتا تھا۔ مجھے گھر کے کام کر کے خوشی ہوتی تھی۔

''ایمان! گھنٹے تک آ جانا، شام کا کھانا بھی بنانا ہے۔کل سے میں کام پر چلا جایا کروں گا۔'' وہ نمبرداروں کا ملازم تھا اور کھیتوں میں کام کرتا تھا۔اسے دو دن کی شادی کی چھٹی تھی اور کل سے اس نے کام پر جانا تھا۔

''چچا! امی کہہ رہی تھی کہ رات کا کھانا بھی ہم بنا کر ایمان کے ہاتھ بھجوا دیں گے۔آپ کل سے اپنے گھر

کھانا بنا لینا۔'' میں نے سفید جھوٹ بولا۔

میں ایمان کو زیادہ سے زیادہ دیر تک اپنے گھر میں رکھنا چاہتا تھا۔ میرا اس کے ہاتھوں کو چھونا اور اس کا خاموش رہنا، یہی وجہ تھی کہ میری امید بندھ گئی تھی۔ اسے میرا اس کے ہاتھوں کو چھونا برا نہیں لگا تھا۔ اگر میری ایمان سے دوستی ہو جاتی تو اگلا مرحلہ بھی میں طے کر لیتا۔ میری ابھرتی ہوئی جوانی کو ایک کنارے کی ضرورت تھی اور میں اپنے لیے ایک کنارہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! میں رات کو آ کر لے جاؤں گا۔ ویسے ابھی میں نے ایک چکر ڈیرے کا بھی لگانا ہے، واپسی پر شاید مجھے رات ہو جائے گی۔'' اس نے رضامندی ظاہر کی تو میں نے ایک اور کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔

''چچا! میں خود ہی ایمان کو گھر چھوڑ جاؤں گا۔'' میں ایمان پر ایک اور ٹرائی کرنا چاہتا تھا۔

رات کو واپسی پر اندھیرا ہوتا اور میں اسی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ مجھے اپنی کشتی کنارے پر لگتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی لیکن اسلم نے میرے سارے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔

''نہیں بیٹا! تم رہنے دینا، میں خود ہی آ کر لے جاؤں گا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''چلو ایمان! امی انتظار کر رہی ہو گی۔'' میں نے ایمان سے کہا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایمان خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

''یار تم لوگ بھی نا! کتنی دیر لگا دی تم لوگوں نے؟ میں گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' ارم نے ہمیں گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو لپک کر ہمارے پاس آ گئی۔

وہ ایمان کو لے کر چولہے کے پاس بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ سموسے بھی کھا رہی تھیں۔

''او ہیلو! میں صبح سے ذلیل ہو رہا ہوں، ابھی ایمان آ گئی تو مجھے کونے میں لگا دیا ہے۔ مجھے بھی بھوک لگی ہے۔'' مجھے اپنے آپ کو نظر انداز ہوتا ہوا دیکھ کر غصہ آ گیا۔

''جی بھائی! میں ابھی آپ کو پراٹھا دیتی ہوں، سموسے بھی آپ کھاؤ گے نا؟'' ارم نے جلدی سے ایک

پلیٹ میں پراٹھا رکھا اور اس کے اوپر تین چار سموسے رکھ دیئے۔

میں نے ارم کے ہاتھ سے پلیٹ پکڑی اور وہیں زمین پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ مجھے ایمان کے پاس بیٹھ کر اچھا لگ رہا تھا۔ ایمان ارم کے ساتھ گھل مل گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک دوسرے کی پکی سہیلیاں بھی بن گئی تھیں۔ ایمان ارم کو اپنے گاؤں کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ گجرات سے یہاں آئی تھی اور گجرات بہاولپور سے بہت دور تھا۔ ہم ریگستانی لوگ تھے لیکن گجرات میں بہت بارشیں ہوتی تھیں۔ وہ سرسبز و شاداب علاقہ تھا جہاں چاول اور گنے کی کاشت ہوتی تھی۔

''رضوان! تم اٹھو ادھر سے، تم کیوں لڑکیوں میں بیٹھ کر ان کی باتیں سن رہے ہو؟'' امی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''ایمان بیٹی! کیسی ہو؟'' امی نے شفقت سے ایمان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی خالہ! میں ٹھیک ہوں۔'' ایمان امی کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تم نے اگر کھانا کھالیا ہے تو نکلو ادھر سے، لڑکیوں کو باتیں کرنے دو!'' امی نے ایک بار پھر مجھ سے خفا ہو کر کہا تو میں نے اٹھنے میں ہی عاقبت سمجھی۔

''اس کو رات کا کھانا بھی بنا کر دینا ہے، ادھر بہانہ مار کر آیا ہوں۔ رات کو چچا آ کر لے جائے گا ہماری اس چچی کو۔'' میرا اٹھنے کو دل نہیں کر رہا تھا اس لیے میں نے ایمان پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ جس کا اس نے اچھا خاصا برا منایا۔

''ارم! کچھ لوگ اتنے ڈرپوک ہوتے ہیں جن کی ایک انگلی لگاتے ہوئے بس جان نکلتی ہے۔'' ایمان نے نارمل لہجے میں ارم سے کہا تو میری سچ میں جان نکل گئی۔

اگر وہ ابھی ہاتھ والی بات بتا دیتی تو مجھے امی کے جوتوں سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ گھر میں میری اچھی خاصی عزت تھی اور میں اس کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ارم! اگر دکان سے کوئی چیز وغیرہ منگوانی ہو تو مجھے بتا دو، میں لا دیتا ہوں۔ اپنی سہیلی سے بھی پوچھ لو اگر

کچھ چاہیے تو میں لا دیتا ہوں۔'' میں نے ایمان کی طرف التجائیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کرلیا تھا کہ آج کے بعد کبھی اس کو چھونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں حقیقت میں ڈر گیا تھا۔

''رضوان بھائی! آپ جاؤ، ہمیں کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔'' ارم اور امی کا دھیان میری طرف گیا تو ایمان نے مجھے آنکھ ماردی۔

اس کے چہرے پر ابھی بھی مسکراہٹ تھی لیکن میرے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اگر میں ایک منٹ بھی اور رکتا تو ایمان شاید سب کچھ بتا دیتی مگر میں نے ان کو ان کے حال پہ چھوڑا اور اندر کمرے میں آ کر چارپائی پہ لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر تک تینوں بھائی بھی کرکٹ کھیل کر واپس گھر آ گئے۔ دو تین بار ارم مجھے باہر لے جانے کے لیے آئی لیکن میں نے منع کر دیا۔ میرا باہر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

میں ڈر رہا تھا کہ اگر ایمان نے کوئی بات کر دی تو کام خراب ہو جائے گا لیکن ایمان نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ایمان ہنس مکھ اور ملنسار لڑکی تھی۔ خدا نے اس کو حسن کی دولت سے بے حساب نوازا تھا اور وہ بہت جلد لوگوں میں گھل مل جاتی تھی۔ شام تک وہ ہمارے گھر کی ایک فرد بن چکی تھی۔ شام کو جب ابو گھر آئے تو وہ بھی ایمان سے مل کر بہت خوش ہوئے، انہیں بھی ایمان بہت پسند آئی۔

''بھائی اٹھو! کھانا تیار ہو گیا ہے۔'' ارم مجھے کھانے پر بلانے آ گئی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے! میرے سر میں درد ہو رہا ہے، آپ لوگ کھانا کھاؤ۔''

ابھی بھی میرا باہر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ ارم ایک منٹ تک مجھے گھورتی رہی اور پلٹ کر واپس چلی گئی۔ پتہ نہیں اس نے باہر جا کر کیا کہا کہ گھر کے سارے افراد میری چارپائی کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

''کیا ہو گیا ہیرو کو؟'' ایمان نے شرارتی لہجے میں کہا تو سارا گھر ہنسنے لگا۔

''سنا ہے ہیرو کے سر میں درد ہو رہا ہے؟'' ایمان ایک بار پھر مذاق کے موڈ میں تھی۔

''میں ٹھیک ہوں!'' میں نے جلدی سے اٹھ کر چپل پہنی اور صحن میں لگے نلکے پر ہاتھ دھونے لگا۔

''ہماری بیٹی ایمان تو لگتا ہے ڈاکٹر ہے، ایک منٹ میں ہی رضوان کو ٹھیک کر دیا ہے۔'' ابو نے بڑی

اپنائیت سے ایمان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ارم اور ایمان نے باہر صحن میں کپڑا بچھا کر کھانا لگا دیا تھا۔ ہم سب گھر والے زمین پر ہی کپڑا بچھا کر کھانا کھاتے تھے۔ میں ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ ہلکی پھلکی گپ شپ لگاتے ہوئے ہم نے کھانا ختم کیا تو ایمان نے ارم کے ساتھ مل کر برتن اٹھا لیے۔

''کتنی پیاری بچی ہے! بالکل ہماری ارم کی طرح لگ رہی ہے۔ خدا نے پتہ نہیں کیوں اس بچی کے نصیب اچھے نہیں لکھے۔''

میرے ابو ایک جہاں دیدہ آدمی تھے۔ ایمان اور اسلم کی اس بے جوڑ شادی پر ان کا دل بھی دکھی ہوا تھا لیکن وہ بھی اس معاشرے کا ایک حصہ تھے۔ ہم غریب لوگ تھے اور ایمان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ایمان اور ارم نے مل کر برتن دھو لیے تھے اور اب وہ دونوں ابو کے دائیں اور بائیں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ایک دن میں ہی ایمان نے میرے سارے گھر والوں کو اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔

''چاچو! آپ چائے پیئو گے؟ میں چائے بہت اچھی بناتی ہوں۔'' ایمان نے ابو کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹا! ایک کپ چائے کا بنا دو۔'' ابو نے ایمان کے گالوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا۔

''ابو! آپ کب سے چائے پینے لگے ہو؟'' ارم نے حیرانگی سے ابو سے پوچھا۔ ہمارے سارے گھر والے حیران ہو کر رہ گئے تھے۔

ابو نے زندگی میں کبھی چائے نہیں پی تھی۔ وہ چائے نہیں پیتے تھے بلکہ وہ ہمیں بھی چائے پینے سے منع کرتے تھے۔ گھر میں چائے صرف امی ہی پیتی تھی۔ ہم بچے کبھی کبھی امی کے ساتھ چائے پی لیا کرتے تھے لیکن ابو نے کبھی چائے نہیں پی تھی۔

''میرے پیارے ابو جان! آج ایمان باجی کے ہاتھ سے چائے پیئیں گے۔'' عامر نے باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہم سب سے چھوٹا تھا اور اس نے آتے ہی ایمان کو باجی بنا لیا تھا۔

تھوڑی دیر تک ایمان چائے بنا کر لے آئی تو ہم سب نے اپنی اپنی چائے کی پیالی پکڑی اور چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ میری امی چائے بہت اچھی بناتی تھی۔ ماں کے ہاتھ کا کھانا بچوں کو ہمیشہ اچھا لگتا ہے لیکن مجھے ایمان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے زیادہ مزیدار لگ رہی تھی۔ ایمان چائے واقعی بہت اچھی بناتی تھی۔

''ابو! باہر چچا اسلم آیا ہے ایمان کو گھر لے جانے کے لیے۔'' دروازے پر دستک کی آواز سن کر عامر باہر گیا تھا اور اس نے واپس آ کر کہا۔

''بیٹا! اسلم سے کہو کہ وہ گھر چلا جائے، میں کھانا پیک کر کے خود ایمان کو لے کر گھر آ جاتا ہوں۔'' ابو نے عامر کو کہا اور ارم اٹھ کر اسلم کے لیے کھانا پیک کرنے لگی۔ ایمان کی شوخی اچانک ختم ہو گئی تھی اور وہ کسی ہرنی کی طرح خوفزدہ لگ رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''چلو بیٹا! میں تم کو گھر چھوڑ آؤں۔'' کھانا پیک ہو گیا تو ابو نے ایمان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ایمان بیٹی!'' ابو نے ایمان کو گلے سے لگا لیا۔

''ایمان بیٹا! مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے باپ کی کیا مجبوری تھی جو اس نے اتنی پیاری بیٹی کو اسلم کے ہاتھ فروخت کر دیا لیکن یقین کرو میری بیٹی! تم میری ارم کی طرح ہو اور میں تیرے باپ کی جگہ ہوں۔ خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ ثابت قدم رہنا میری بیٹی! خدا کوئی نہ کوئی راہ نکال دے گا۔'' وہ ہولے ہولے ایمان کی کمر تھپتھپا کر اسے دلاسہ دے رہے تھے اور ایمان آہستہ آہستہ واپس اپنے روایتی موڈ میں آنے لگی۔

''بیٹا! اپنے آپ کو کبھی اکیلا مت سمجھنا! ارم تمہاری بہن اور یہ چاروں تمہارے بھائی ہیں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے، تم جب مرضی اس گھر میں آ سکتی ہو۔'' ابو نے ایمان کو تسلی دیتے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ چمکنے لگا اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر شرارت آ گئی۔

''چاچو! ایک بہن اور تین بھائی! یہ ہیرو میرا بھائی نہیں ہے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پورا گھر ایمان کی بات پر مسکرانے لگا اور میں ندامت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کیوں جی! یہ تمہارا بھائی کیوں نہیں ہے۔'' ارم ایمان کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''ہم کوئی چھوٹی موٹی چیز تھوڑی ہیں جو ایسے راہ چلتے ہوئے کسی کو بھی اپنا بھائی بنا لیں؟ ایمان احمد کا بھائی بننا قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ کیوں راضی صاحب! ہم ایسے ہی کسی کو تھوڑی بھائی بنا سکتے ہیں۔'' اس نے میرے نام کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

''جی راضی بھائی! ایمان ہر کسی کو اپنا بھائی نہیں بناتی۔'' ارم نے ایمان کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

''چلو بیٹی چلو! دیر ہو رہی ہے۔'' ابو ایمان کو ساتھ لے کر اس کے گھر کی طرف چل دیئے اور ہم لوگ پیچھے کافی دیر تک ایمان کی باتیں کرتے رہے۔

اگلے دن چونکہ ہم سب نے سکول جانا تھا اس لیے ہم سب نے رات کو ہی اپنے اپنے سکول بیگ تیار کئے اور سو گئے۔ اگلے دن میں صبح صبح جاگا تو ایمان امی کے ساتھ چولہے کے پاس بیٹھی روٹیاں بنا رہی تھی۔ اسلم نے چونکہ صبح صبح کام پر چلے جانا تھا اور ایمان گھر میں اکیلی ہو جاتی اس لیے وہ ایمان کو ہمارے گھر چھوڑ کر خود کام پر چلا گیا۔

''امی! اس بلا کو کدھر صبح صبح اپنے پاس بٹھایا ہوا ہے؟'' میری رات خیریت سے گزر گئی تھی اور ایمان نے ہاتھ لگانے والی بات کسی کو نہیں بتائی تھی اس لیے میں شیر ہو گیا تھا۔

''خالہ! یہ آپ کا ہی بیٹا ہے نا؟ ایک بار سیالکوٹ والوں سے پوچھ لو کہیں انہوں نے غلطی سے غلط لڑکا تو نہیں دے دیا آپ کو؟ اس کی نہ تو شکل ملتی ہے آپ لوگوں سے اور نہ ہی لہجہ۔'' وہ میری امی سے مزاحیہ موڈ میں پوچھ رہی تھی۔

سیالکوٹ میں رہنے کی وجہ سے میرا لہجہ سیالکوٹی ہو گیا تھا اور وہاں کی اچھی آب و ہوا کی بدولت میرا رنگ دوسروں کی نسبت قدرے گورا تھا۔

''بیٹا! تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو، ناشتہ تیار ہے۔ ناشتہ کرو اور خیریت سے سکول جاؤ۔'' امی نے مجھے کہا تو میں منہ ہاتھ دھونے لگا۔

تھوڑی دیر تک ہم سب بھائیوں نے ناشتہ کر لیا اور ارم کو ساتھ لے کر سکول چلے گئے۔ دوپہر کو تین بجے ہم سکول سے چھٹی کر کے گھر آ گئے۔ ایمان ابھی تک ہمارے گھر میں ہی تھی۔ امی نے ارم کے کپڑوں کا ایک جوڑا

ایمان کو دے دیا تھا اور اس وقت ایمان ارم والا سوٹ ہی پہنے ہوئے تھی۔

''ہائے امی! ایمان کتنی پیاری لگ رہی ہے!'' ارم نے ایمان کو دیکھا تو وہ بھاگ کر ایمان کے گلے لگ گئی۔

''امی! اس کی نظر اتارلو ورنہ ایمان کو نظر لگ جائے گی۔'' ارم مسلسل ایمان کو دیکھے جارہی تھی۔

''مجھے اتنی جلدی نظر نہیں لگتی ارم! بے فکر رہو، ہاں! سیالکوٹیوں سے تھوڑا بچا لینا، ان کی نظر بڑی بری ہوتی ہے۔'' اس نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے غصے سے اس کو گھورا اور اندر کمرے میں جاکر یونیفارم تبدیل کرنے لگا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر بھائی تو کرکٹ کھیلنے چلے گئے اور امی بھی کھیتوں پر چلی گئی کیونکہ انہیں رات کے لیے سبزی توڑ کر لانی تھی۔ گھر میں ارم، ایمان اور میں ہم تینوں ہی رہ گئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر ایمان سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ارم مسلسل ایمان کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی اور مجھے مسلسل غصہ آرہا تھا۔ ان دونوں کو علیحدہ کرنے کی کوئی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ دونوں برآمدے میں بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ میں کبھی برآمدے اور کبھی کمرے کے چکر لگا رہا تھا۔

''بھائی! کیا بات ہے؟ ادھر بیٹھ جاؤ ہمارے پاس۔'' ارم کو میری بے چینی کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''کیا حال ہے راضی صاحب!'' ایمان نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''راضی، واؤ! اچھا نام ہے۔ آج سے میں بھی اپنے بھائی کو راضی ہی کہوں گی۔'' ارم نے ایمان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میرے اس نئے نام کا آغاز ہورہا تھا۔ ایمان نے محبت سے میرا نام راضی رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے راضی ہی کہا کرتی تھی اور آہستہ آہستہ یہی نام میری شخصیت کا حصہ بن گیا۔ آج بھی مجھے گاؤں میں سب راضی ہی کہتے ہیں۔

''ارم! تم اپنی سکول یونیفارم تو تبدیل کرلو! ابھی تک وہی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔'' میں نے ارم کو یاد دلایا تو وہ اندر کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

برآمدے میں ایمان اور میں اکیلے رہ گئے۔ مجھے ایمان کے ساتھ تنہائی مل گئی تھی۔ آج سکول میں بیٹھ کر میں نے جو جو منصوبے بنائے تھے وہ سب ہوا ہو گئے اور میرے دماغ نے جیسے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے صرف چار پانچ منٹ ہی ملے تھے۔ اگر ارم کپڑے بدل کر آ جاتی تو مجھے پھر کبھی یہ موقع نہ ملتا۔ انہی چار پانچ منٹوں میں مجھے کچھ کرنا تھا لیکن میری ہمت جواب دے رہی تھی۔

''ایمان!'' میں نے بمشکل کہا۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''جی'' وہ نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم مجھے بھائی کیوں نہیں کہتی ہو؟'' میں نے ہمت جمع کرتے ہوئے کہا۔

''جی وہ۔۔۔وہ مجھے اچھا نہیں لگتا آپ کو بھائی کہنا۔'' اس نے شرماتے ہوئے کہا تو مجھے حوصلہ مل گیا۔

وہ میرے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی اور ارم کسی بھی پل باہر آ سکتی تھی۔ اگر وہ مجھے بھائی نہیں سمجھتی تو اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ بھی مجھ سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے ایک بڑا اقدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا، آر یا پار۔

''رضوان بیٹا! کچھ تو کرو۔'' میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے بائیں گال پر رکھ دیا۔ روئی کی طرح سفید نرم نرم گال میرے ہاتھ کی انگلیاں اس کی گال میں پیوست ہو گئیں۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

''کیا ہوا بھائی! آپ کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ نا!'' ارم کپڑے تبدیل کر کے آ گئی تھی۔

''نہیں نہیں! کچھ نہیں! میں ڈیرے پر جا رہا ہوں، تم دروازہ اندر سے بند کرلو۔'' میں نے گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا اور جلدی جلدی گھر سے باہر نکل گیا۔

مجھے ایمان کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ پتہ نہیں اسے اتنی جلدی کیسے غصہ آ گیا تھا۔ شاید میں نے اس کے گالوں کو ہاتھ لگا کر غلط کیا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں ڈیرے پر جانے کی بجائے یونہی بے مقصد گلیوں میں گھومتا رہا۔

جب شام کا اندھیرہ پھیلنے لگا تو میں گھر آ گیا۔ میں شرمندہ تھا اور ایمان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا، میں نے سوچا کہ وہ اب تک اپنے گھر جا چکی ہو گی مگر میرا اندازہ غلط نکلا، وہ ابھی تک ہمارے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا۔

''لو! راضی بھی آ گیا۔'' ابو نے مجھے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ ایمان کی دیکھا دیکھی ابو بھی مجھے راضی کہنے لگے تھے۔

''کدھر چلے گئے تھے راضی بیٹا؟'' امی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھانا چاہا لیکن میں نے ان سے اپنا بازو چھڑوا لیا۔

''امی! میرا نام راضی نہیں ہے، مجھے رضوان کہو یا نانو! کوئی بھی مجھے راضی نہیں کہے گا۔'' میں نے غصے سے کہا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔

''کیا ہوا ہے اسے؟ بڑا غصے میں لگ رہا ہے۔'' ابو نے ارم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے لاعلمی سے کندھے اچکا دیئے۔

''جاؤ! اسے لے کر آؤ، پھر کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے جلدی سونا ہے تاکہ صبح جلدی کام پر جا سکوں، کل بھی بہت دیر ہو گئی تھی اس لیے نیند پوری نہیں ہو سکی۔'' ابو کل ایمان کو چھوڑنے گئے تھے تو وہاں چاچا اسلم کے پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔ رات کو ان کی واپسی بڑی دیر سے ہوئی تھی اس لیے ان کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔

''میں لے کر آتی ہوں اس سیالکوٹی شہزادے کو۔'' ایمان نے اونچی آواز سے کہا اور وہ میرے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں اپنے چہرے پہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

''لگتا ہے ہمارا شہزادہ ناراض ہو گیا ہے!'' ایمان نے میرے چہرے سے چادر ہٹا کر کہا۔ وہ اکیلی ہی کمرے میں آئی تھی اور باقی سارے گھر والے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''چلو! تمہیں باہر بلا رہے ہیں۔'' ایمان نے میرے اوپر سے چادر اٹھا کر ایک طرف رکھ دی تھی۔

''میں نے نہیں جانا! تم جاؤ اور مجھے تم سے بات بھی نہیں کرنی۔'' میں نے ناراضگی سے کہا۔

''چلو اٹھو! غصہ چھوڑ دو، میں تمہیں لینے آئی ہوں۔'' وہ مجھے منانے لگی۔

''تم کیوں آئی ہو مجھے لینے؟ تم اپنے گھر جاؤ! میں خود ہی باہر آ جاؤں گا۔'' میں نے اپنے گھر کی دھونس جماتے ہوئے کہا۔

''چلو جیسے آپ کی مرضی! ورنہ ہم تو دوستی کرنے آئے تھے، شاید آپ کو ہی ہماری دوستی پسند نہیں ہے۔'' اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''نہیں نہیں! میں چلتا ہوں، بس ایک منٹ!'' میں نے جلدی جلدی کہا اور اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ابھی ہم دوست ہیں نا؟'' میں نے خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں راضی! دوستی تو کر لی اور آج سے ہم دوست ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔

''راضی! دوپہر کو تم نے اس گال کو گندہ کر دیا تھا، اب دوسرے گال کو بھی گندہ کر دو یار!'' اس نے اپنے بائیں گال پر اپنا ہاتھ رکھا اور دایاں گال میرے آگے کر دیا۔

ایک گنہگار شخص کو جیسے اچانک جنت مل گئی ہو۔ نرم و ملائم احساس میری انگلیوں کی پوروں سے ہو کر میری روح تک کو سرشار کرنے لگا اور میں دنیا بھول گیا۔ اگر یہ سلسلہ مزید تھوڑی دیر اور چلتا تو شاید میں ہمیشہ کے لیے لذّت کی گہرائیوں میں کھو جاتا۔ لیکن اس نے اپنے چہرے سے میرا ہاتھ ہٹا دیا۔

''چلو! باہر سب انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ پری پیکر واپس مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی باہر آ گیا۔

''راضی بیٹا! ایمان کو گھر چھوڑ آؤ۔'' ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو ابو نے مجھ سے کہا۔

''جی ابو جی!'' میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ گلی میں اندھیرا ہوتا تھا اور میں اس اندھیرے میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔

''چلو راضی!'' ایمان نے مجھ سے کہا تو میں اسے لے کر باہر آ گیا۔

گلی میں وہ میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ میں نے خاموشی سے گلی کراس کی اور اسے لے کر اس کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''راضی! تم نے وہ کہانی سنی ہوئی ہے جس میں ایک شہزادی کو دیو اٹھا کر لے جاتا ہے اور پھر ایک شہزادہ سات سمندر پار کر کے اس شہزادی کو بچانے کے لیے آجاتا ہے؟'' اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھول لیا۔

''کیا تم نے یہ کہانی سنی ہوئی ہے؟'' میں نے ایک ہاتھ سے دروازے کو بند ہونے سے روکا۔

''ہاں! میں نے یہ کہانی سنی ہوئی ہے، بچپن میں میری نانی یہ کہانی مجھے سنایا کرتی تھیں۔ کیوں کیا ہوا؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''راضی! شاید تم بھی کسی دن اس گلی کو پار کرلو۔'' ایمان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''شہزادی تو اس گلی کے پار بھی بیٹھی ہوئی ہے راضی!'' اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ چھوڑا اور گھر میں داخل ہوگئی۔

میں نے دروازہ چھوڑا تو وہ خود بخود بند ہو گیا۔ میں گلی میں اکیلا رہ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری گلی ایک بہت بڑے سمندر میں تبدیل ہوگئی۔ میں بے یار و مددگار اس سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

''نا نو یار! لڑکی تو بہت پیاری آئی ہے سامنے والے گھر میں، اسلم بوڑھا آدمی ہے اس سے کیا ہوگا؟ تم کوشش کرو! تمہارے ساتھ پھنس جائے گی۔'' وحید نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ اس کا لڑکیوں کے معاملے میں مجھ سے زیادہ تجربہ تھا۔ ہمارے گاؤں کی ایک طرف ۵ مرلہ ہاؤسنگ سکیم تھی جہاں پانچ پانچ مرلے کے چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے تھے۔ سکول سے واپس آ کر وہ سارا سارا دن ادھر ہی گھسا رہتا تھا۔ وہاں اس نے ایک لڑکی سے دوستی بھی کر لی تھی اور وہ سارا دن اسی لڑکی کے آگے پیچھے گھومتا رہتا تھا۔ وہ تو ایک بار اس لڑکی کو بیٹھک میں بھی لے آیا، میں باہر کھڑا تھا۔ باہر نکل کر اس نے لڑکی سے میرے ساتھ بھی لیٹنے کو کہا تھا لیکن لڑکی نہیں مانی۔ وہ وحید کو سچ میں پسند کرتی تھی۔

پھر وحید نے اس لڑکی کو چھوڑ کر ایک اور لڑکی سے دوستی کر لی۔ وہ میرا سچا دوست تھا اور اس نے دوسری لڑکی سے بھی کہا تھا لیکن مجھے اس نے بھی جواب دے دیا۔

مجھے دو دو لڑکیوں نے ٹھکرایا ہوا تھا اور میں ابھی تک کنوارہ تھا۔ ایمان کی صورت میں مجھے ایک اور چانس مل رہا تھا۔ رات کو جب اس نے اپنے گالوں کو ہاتھ لگانے دیا تھا اور پھر جس طریقے سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا، مجھے لگ رہا تھا وہ میرے ساتھ لیٹنے کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔ ویسے بھی وہ اس بوڑھے اسلم کے ساتھ بھی تو سوتی تھی۔ پھر میرے ساتھ لیٹنے میں اسے کیا اعتراض ہوگا؟ میں نے خود غرض انداز سے سوچا۔

کچھ لوگ شاید سوچ رہے ہوں کہ راضی اچھا لکھتے لکھتے اچانک اتنا گندا کیوں ہو رہا ہے۔ شاید کچھ لوگوں کو مجھ پر غصہ بھی آ رہا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں ۸۰ فیصد لڑکے جب کسی لڑکی کی طرف دوستی یا محبت کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تو ان کے دل میں یہی حیوانی جذبہ ہی ہوتا ہے۔ لڑکیوں کی سوچ کے بہت سے زاویئے ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر لڑکے ہمیشہ ایک ہی زاویئے پر سوچتے ہیں۔

یہاں میرا لکھنے کا مقصد ایمان کی توہین ہرگز نہیں! میں ایمان سے عشق کرتا ہوں اور محبت میں فنا ہونے والا انسان کبھی بھی اپنے محبوب کو بدنام نہیں کرتا۔ میں آج بھی ایمان کے نام پر جی رہا ہوں۔

میں یہاں پر صرف حقیقت لکھنا چاہتا ہوں اور حقیقت یہی ہے کہ میں ایک لڑکا ہوں اور شروع شروع میں اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ہی میں ایمان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ مجھے ایک لڑکی چاہیے تھی اور ایمان مجھے گھر بیٹھے بیٹھے مل رہی تھی۔

''کیوں نانو! لڑائی کر رہے ہو ایمان پر؟ قسم سے بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ تمہاری تو لاٹری نکل آئی ہے۔'' اس نے خالص بازاری لہجے میں کہا۔

''نہیں یار! وہ اچھی لڑکی ہے۔ ایسی ویسی نہیں بلکہ شریف ہے۔ تم اس سے دور ہی رہنا ورنہ مار پڑ جائے گی!'' تمام خفیہ راز ہم ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے لیکن پتہ نہیں کیوں میں ایمان والی بات اس کو نہ بتا سکا۔

جب کوئی عورت کسی آدمی کی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو اس آدمی کے دوست اس سے دور ہونے لگتے

ہیں۔ وحید بھی مجھ سے دور ہونے لگ گیا تھا۔سکول سے واپسی پر میں نے چاچا کریم کی دکان سے ۵ روپے کی مونگ پھلی لے لی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا ایمان گھر پر ہی ہوگی اور مونگ پھلی بھی میں اسی کے لیے ہی لے کر جارہا تھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر میں گھر میں داخل ہوگیا۔ امی باہر صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر چاول صاف کررہی تھیں۔اندر کمرے میں آہستہ آواز میں میوزک چل رہا تھا۔طارق بھائی مہدی حسن کی نئی غزلوں کی ایک کیسٹ لے کر آئے تھے اور اندر کمرے میں وہی میوزک چل رہا تھا۔ میں سکول سے ایک پیریڈ پہلے چھٹی کر کے آ گیا تھا۔

''امی! اندر کمرے میں کون ہے؟'' میوزک چل رہا تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ شاید ایمان اندر بیٹھی ہو۔

''ایمان اندر میوزک سن رہی ہے۔تم جلدی سے بستہ اندر رکھو اور آ کر کھانا کھا لو! میں نے ابھی ابھی آلو گوبھی کا سالن بنایا ہے۔'' امی نے مجھے پیار سے کہا اور میں بستہ اٹھائے اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

آج پھر ایمان اندر کمرے میں اکیلی مل گئی تھی اور میری انگلیوں کی پوروں میں ایک بار پھر آگ بھڑکنے لگی۔میرے ہاتھ آگ سے جل رہے تھے اور ان کو صرف ایمان کے نرم گالوں سے ہی سکون مل سکتا تھا۔

''ہائے ایمان! کیسی ہو؟'' میں نے بستہ کمرے کے ایک کونے میں پھینکا اور دروازے کے آگے کھڑا ہو گیا۔

''تم۔۔۔تم اتنی جلدی کیسے گھر آ گئے؟'' ایمان نے مجھے کمرے میں دیکھا تو جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''باقی بھی گھر آ گئے ہیں یا تم اکیلے ہی آئے ہو؟'' وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے پر آ گئی تھی اور اب باہر جانے کے لیے راستہ تلاش کررہی تھی۔لیکن میں دروازے کے آگے کھڑا ہوا تھا اس لیے وہ باہر نہیں جاسکتی تھی۔

''راضی! خالہ آ جائے گی، آپ میرا راستہ چھوڑ دو! مجھے باہر جانا ہے۔'' اسے میری کمینگی کا پتہ تھا اس لیے وہ مجھے امی کا ڈراوا دے کر باہر نکلنا چاہتی تھی۔

''امی باہر صحن میں بیٹھی ہوئی ہیں، اگر آپ نے جانا ہے تو چنگی کٹوا کر (ٹیکس دے کر) جا سکتی ہو۔'' میں نے بے شرمی سے کہا۔ میں اتنے اچھے موقعے کو کیسے ضائع کر سکتا تھا۔

''پلیز راضی! خالہ آجائے گی، رات کو جیسے تم کہو گے میں ویسے ہی کروں گی، ابھی مجھے جانے دو!'' وہ میری منتیں کرنے لگی۔ اسے امی کے اندر آنے کا ڈر تھا۔

''نہیں! ایک بار اپنے گالوں کو ہاتھ لگانے دو اس کے بعد چلی جانا۔ پلیز! بس ایک بار، اس کے بعد میں کچھ نہیں کروں گا اور خاموشی سے ایک طرف ہو جاؤں گا۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

میرا منہ رونے والا ہو گیا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ابھی رونے لگ جاؤں گا۔ آخر کار اسے مجھ پر ترس آ ہی گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے چہرے پر رکھ لیا۔

میرے دونوں ہاتھ اس کے چہرے پر تھے اور میں اس کے نرم گالوں کے لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ کل ایک گال پہ ہاتھ رکھا تھا اور آج اس کا پورا چہرہ میرے ہاتھوں میں تھا۔ اس کا قد مجھ سے ۱۳ انچ چھوٹا تھا۔ وہ نیچے زمین کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کے سلکی سلکی بال نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اس کے چہرے کے گرد تھوڑا مضبوط کیا اور اس کا چہرہ اوپر اٹھا دیا۔

''ایمان تم بہت خوبصورت ہو!'' میں نے آہستہ آواز میں کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بالکل خاموشی سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''ایمان!'' میں نے اس کو پکارا تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ باہر امی بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ کسی بھی لمحے اندر آ سکتی تھیں۔ اگر وہ ہم دونوں کو ایسی حالت میں دیکھ لیتیں تو مجھے تو مار پڑتی ہی پڑتی، ایمان کا ہمارے گھر میں داخلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا اس لیے ہم دونوں کو ہی ڈر لگ رہا تھا۔

بچپن میں ہم ایسے ہی بے خوف ہوتے تھے۔ سکول سے بھاگنا، چوری چھپے کھیتوں سے آم توڑنا، تاش کھیلنا اور سگریٹ پینا وغیرہ۔ یہ ساری بے وقوفیاں بچپن میں ہی ہوتی ہیں۔ بچپن میں معصوم سی بیوقوفیاں نہ ہوں تو پھر بچپن کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں بھی اس وقت بے خوف ہو رہا تھا۔ ماں کے دیکھ لیے جانے کا ڈر تو تھا لیکن گھر

والوں کی مار سے زیادہ ایمان کے گالوں میں نشہ تھا۔

میں آہستہ آہستہ اس کے چہرے کو سہلاتا رہا اور وہ آنکھیں بند کئے بالکل خاموشی سے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے گالوں کو سہلاتے ہوئے اپنی انگلی ایمان کے ہونٹوں پر رکھ دی۔ برف کی طرح ٹھنڈے چہرے پر سرخ ہونٹ۔۔۔کبھی کبھی خدا بھی کمال دکھا دیتا ہے۔ ایمان نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور پھر دوبارہ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے چہرے، گال اور آنکھوں کے گرد گھوم رہی تھیں۔ اس کا پورا چہرہ میری دسترس میں تھا اور میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

چاند سا سفید چہرا اور پتلے پتلے سرخ ہونٹ۔۔۔ اس کا چہرہ میرے ہاتھوں میں چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ میرے ہاتھوں کے لمس نے اسے مدہوش کر دیا تھا اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

خدا نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ اس کا کبھی بھی دل نہیں بھرتا اور نہ ہی وہ کسی چیز سے مطمئن ہوتا ہے۔ ایک چیز مل جائے تو دوسری چیز کی خواہش کرنے لگتا ہے۔

اس کا چہرہ میرے ہاتھوں میں تھا اور میرا دل اس کے ہونٹوں پر بوسہ لینے کو مچل رہا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹوں کو چومنے کو دل کر رہا تھا لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ مجھے کبھی بھی ہونٹوں پر بوسہ نہ لینے دیتی۔ ہونٹ تو بڑی دور کی بات ہے وہ مجھے گالوں پر بھی بوسہ نہ لینے دیتی۔ اس لیے جو کچھ مل رہا تھا میں اسی پر گزارہ کر رہا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے گالوں اور ہونٹوں کو چھوا تھا۔ میرے لیے یہی بہت تھا اور میں اسی پل کا مزا لے رہا تھا۔

''ایمان!'' میں نے آہستہ سے اسے پکارا لیکن وہ آنکھیں بند کئے خاموش کھڑی رہی۔

''رضوان بچے! کیا ساری زندگی اسی چہرے پر گزارہ کرتے رہو گے؟'' میرے دل میں شیطان نے وسوسہ ڈالا اور وہ مجھے مزید کچھ اور کرنے پر اکسانے لگا۔

''رضوان صاحب! چہرے سے باہر نکلو، اس چہرے سے نیچے بھی ایک دنیا آباد ہے۔ چہرے سے نیچے کی اس حیرت انگیز دنیا میں بھی قدم رکھو۔ رضوان صاحب! ہمت کرو ورنہ ساری زندگی ہی نامراد رہو گے!'' میں

نے دل میں سوچا تو میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔

میں نے ایک ہاتھ ایمان کے چہرے پر ہی رہنے دیا اور دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ یہ واقعی ایک حیرت انگیز دنیا تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کو ایمان کے سینے پر رکھا اور آہستہ آہستہ اسے مسلنے لگا۔

''چٹاخ۔۔۔'' ایک زوردار آواز آئی اور ایمان کا ہاتھ میرے گالوں پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔ میں نے بمشکل خود کو نیچے زمین پر گرنے سے بچایا۔

ایمان غصے سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنی پوری طاقت سے تھپڑ مارا تھا اس لیے اس کی انگلیوں کے نشانات میرے گالوں پر ثبت ہو گئے تھے اور وہ غصے سے پھنکار رہی تھی۔

''تم سیالکوٹ میں ہی اچھے تھے! شاید تم غلط جگہ پر پیدا ہو گئے ہو۔ یقین نہیں آتا اتنی پیاری فیملی میں تم جیسے بے غیرت لڑکے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔'' اس نے مجھے ایک طرف دھکا دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

میرے چہرے پر ایمان کی انگلیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ کمرے میں چلنے والے میوزک کی وجہ سے تھپڑ کی آواز باہر امی تک نہیں گئی تھی۔ میری زندگی میں ہر چیز پہلی بار ہو رہی تھی۔ پہلی بار کسی لڑکی کے چہرے اور سینے پر ہاتھ رکھا تھا اور پہلی بار ہی کسی لڑکی سے تھپڑ بھی کھا لیا تھا۔ مجھے ایمان سے تھپڑ کھانے کا کوئی دکھ نہیں ہوا تھا۔ ایسے تھپڑ تو مجھے سکول میں روزانہ پڑتے تھے۔

پاکستان میں آج سے بیس سال پہلے سکولوں میں استاد بہت مارتے تھے۔ اس زمانے میں تو ماں باپ اور بڑے بھائی بھی اپنے سے چھوٹوں کو ذرا ذرا سی غلطی پر مارتے تھے لیکن اب نیا زمانہ آ گیا ہے اور گھر میں ماں باپ اپنے بچوں کو پیار سے ڈانٹتے ضرور ہیں لیکن مارتے نہیں ہیں۔

گورنمنٹ کنٹرول تو کر رہی ہے مگر پاکستان میں آج بھی کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں سکولوں میں بچوں کو چھڑی سے مارا جاتا ہے۔ ہم سکولوں میں استادوں سے مار کھا کھا کر بڑے ہوئے ہیں لیکن یہ چیزیں میں بھی جانتا ہوں کہ بچوں پر تشدد چاہے وہ ذہنی ہو یا جسمانی، کبھی بھی صحیح نہیں ہوتا۔ وہ بچے کی آنے والی زندگی میں ہمیشہ مشکلات ہی پیدا کرتا ہے۔

ایمان باہر جا کر امی کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ایک اچھی خاصی لڑکی ہاتھ آتے آتے پھسل گئی تھی۔ مجھے ایمان

کے سینے پر ایسے ہاتھ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ شیطان نے مجھے یہ کام کرنے پر اکسایا تھا۔ ایک نئی حیرت انگیز دنیا کو دریافت کرنے کے چکر میں میں نے اپنی پرانی چھوٹی سی دنیا کو بھی گنوا دیا تھا۔

واہ رے رضوان! تُو تو کولمبس نکلا، انڈیا تلاش کرتے کرتے امریکہ دریافت کر بیٹھا اور گھر بیٹھے بیٹھے حیرت انگیز دنیا دریافت کرنے کے چکر میں تھپڑ کھا بیٹھا۔

میں نے یونیفارم تبدیل کیا اور گھر والے سادہ کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ دوسرے بہن بھائی بھی سکول سے گھر آ گئے تھے اور باہر چولہے کے گرد بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے ایک نظر ایمان پر ڈالی جو مجھے یکسر نظر انداز کئے ارم سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ میں خاموشی سے جا کر ان لوگوں کے درمیان بیٹھ گیا۔

''راضی بھائی! آج پھر سکول سے مار کھا کر آئے ہو؟'' سب سے پہلے ارم کی نظر میرے سرخ ہوتے گال پر پڑی تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''ہاں! وہ ریاضی والے استاد نے مارا ہے۔ آج میں اس کا ہوم ورک نہیں کر کے لایا تھا۔'' میں نے نارمل لہجے میں کہا اور امی کے ہاتھ سے سالن کی کٹوری پکڑ لی۔

میرا کوئی غلط بات کر کے پنگا لینے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ ایمان نے پہلے بھی دو بار میری شکایت نہیں لگائی تھی اس لیے مجھے امید تھی کہ ایمان کبھی بھی یہ بات نہیں بتائے گی۔ ویسے بھی اس نے تھپڑ مار کر اپنے دل کی تسلی کر لی تھی۔ ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ اب وہ کبھی میرے ہاتھ نہیں آئے گی۔

''اپنا ہوم ورک کر کے جاتے! دیکھو ماسٹر نے کتنی زور سے مارا ہے، تمہارا پورا گال سرخ ہو گیا ہے۔'' امی نے میرے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ ماں تھی اس لیے اپنے بیٹے کے سرخ گال دیکھ کر انہیں دکھ ہو رہا تھا۔ میں نے کن اکھیوں سے ایمان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے خیالوں میں مگن نیچے زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں بنا رہی تھی اور اس کے چہرے پر ابھی بھی غصے کے آثار باقی تھے۔

''راضی! پیاز بھی کھاؤ نا کھانے کے ساتھ۔۔۔ایمان! پیاز کی پلیٹ پکڑاؤ راضی کو!'' امی نے پہلے مجھے اور پھر ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پیاز کی پلیٹ ایمان کے پاس پڑی ہوئی تھی۔

''جی خالہ جی!'' اس نے ایک لمحے کے لیے امی کی طرف دیکھا اور پلیٹ پکڑ کر میری طرف بڑھادی۔ میری نظر اس پلیٹ پر نہیں بلکہ ایمان کے اس ہاتھ پر لگی ہوئی تھی جس میں اس نے پلیٹ پکڑی ہوئی تھی۔ بے شک وہ ۳۰ ہزار میں بک کر ہمارے گاؤں میں آئی تھی۔

گورنمنٹ آف پاکستان کا قانون انسانوں کی خرید وفروخت کو جرم قرار دیتا ہے تو پھر اس قانون کی آنکھوں پر شادی کی صورت میں سرخ پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ ایمان کے ہاتھوں پر بھی وہی سرخ رنگ لگا ہوا تھا۔ میں ایمان کے اس مہندی والے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں ایک بار پھر شیطان آ گیا۔ دل نے کہا ایک بار پھر کوشش کرو، ہار مت مانو اور مرد بنو مرد۔۔۔ اور میں مرد بن گیا۔

میں نے پلیٹ لیتے ہوئے اپنے ہاتھ کو ایمان کے ہاتھ سے ٹکرا دیا۔ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور پلیٹ اس کے ہاتھ سے نیچے زمین پر گر گئی۔ مٹی کی چھوٹی سی پلیٹ تھی جو زمین پر گرتے ہی ایک چھناکے سے ٹوٹ گئی۔

''سوری خالہ! مجھ سے پلیٹ ٹوٹ گئی۔ وہ۔۔۔ وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔'' اس کے چہرے پر ندامت کے آثار نظر آنے لگے۔ تھوڑی دیر پہلے جو غصہ اس کے چہرے پر تھا وہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔

غربت چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ ذہنی اور جسمانی اذیت مالی نقصان کے آگے کچھ بھی نہیں۔ وہ شدید ذہنی اذیت سے گزر رہی تھی۔ اس کی مثال ایک ایسی معصوم ہرنی جیسی تھی جو شیروں سے بھرے ہوئے جنگل سے جان بچا کر ایک گھر میں داخل ہو گئی لیکن وہاں بھی اس کا سامنا ایک بھیڑیئے سے ہو گیا۔ وہ باہر جا سکتی تھی اور نہ ہی گھر میں محفوظ تھی۔

ہر رات وہ اپنے بوڑھے شوہر کے بستر پر اذیتوں سے دو چار ہوتی تھی۔ دن کو وہ سکون کی تلاش میں ہمارے گھر آتی تھی لیکن یہاں بھی ایک بھیڑیا اس کی تاک میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ نازک سی لڑکی دو دو محاذوں پر لڑ رہی تھی۔ مردوں کے اس معاشرے میں وہ ایک معصوم سی لڑکی تھی جسے ایک مٹی کی پلیٹ کے ٹوٹ جانے کا دکھ ہو رہا تھا۔

''امی! پلیٹ میرے ہاتھ سے ٹوٹ کر گری ہے۔'' میں نے ایمان کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی تھی۔

زندگی میں پہلی بار میں نے سارا الزام اپنے سر پر لے لیا تھا۔ ایمان نے بے بسی سے میری طرف دیکھا، اس کا چہرہ بہت بھاری ہو گیا تھا۔ شاید پوری دنیا کے سمندر اس کی آنکھوں میں سما گئے تھے لیکن وہ چھوٹی سی لڑکی بہت ہمت والی تھی۔ خدا جب درد دیتا ہے تو اسے سہنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ اگر وہ لڑکی رو دیتی، اپنی آنکھوں میں قید اس سمندر کو آزاد کر دیتی تو شاید پوری دنیا اس پانی میں ڈوب کر ختم ہو جاتی، لیکن وہ برداشت کر گئی۔ اپنی آنکھوں کے سمندر کو واپس اپنے سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں جذب کر گئی۔

''کوئی بات نہیں! پلیٹ ٹوٹ گئی تو کیا ہوا، نئی آ جائے گی۔ چیزیں ٹوٹنے کا اتنا افسوس نہیں کرتے۔'' امی نے شفقت سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

واقعی چیزیں ٹوٹنے کا اتنا افسوس نہیں کرتے لیکن اس کا تو دل ٹوٹا تھا، اس کی تو روح زخمی ہوئی تھی۔ میں ابھی بھی اس کی طرف دیکھ کر زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ دماغ میں نئے منصوبے بنا رہا تھا اور ذہن میں نت نئے طریقے سوچ رہا تھا۔ اسے ٹوٹنا تو تھا ہی ایک دن۔ ایک بوڑھے معذور شخص کی ۱۰ سالہ بیوی۔۔۔ اسے ٹوٹ کر کسی نہ کسی کی جھولی میں تو گرنا ہی تھا تو پھر میں کیوں نہ کوشش کروں؟ میری بھی تو جھولی خالی تھی، مجھے بھی تو کوئی لڑکی چاہیے تھی۔

شیطان ہمارے گھر کی چھت پر بھنگڑے ڈال رہا تھا۔ وہ خوشی سے اپنے شیطانی رقص میں مصروف تھا۔ ایمان ہمارے گھر آتی تھی۔ وہ یہاں ہمارے گھر میں کھاتی تھی، پیتی تھی تو پھر اس میٹھے پھل پر پہلا حق میرا ہی تھا۔ میں نے شکاری نظروں سے ایمان کے سراپا کو دیکھا۔ جہاں ایک خوفزدہ ہرنی اپنے سامنے موجود بھیڑیئے کو دیکھ رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر بھائی تو کرکٹ کھیلنے کے لیے باہر چلے گئے اور ارم ایمان کو لے کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ وہ وی سی آر پر انگلش فلم لگا کر دیکھنے لگیں۔

اس دور میں انگلش فلمیں ہندی زبان میں ڈب ہو کر بازار میں آنے لگی تھیں۔ پاکستانی فلم انڈسٹری نے اس وقت اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ لوگ انڈیا کی فلموں کو پسند کرتے تھے کیونکہ پاکستان اور انڈیا کی زبان تقریباً ایک ہے۔ انڈیا کی فلم انڈسٹری بھی بہت بڑی تھی اور وہ فلمیں بھی بہت اچھی بناتے تھے۔ پاکستان میں انڈین فلموں کی نمائش پر پابندی تھی اس لیے انڈین فلمیں ویڈیو کیسٹ کی شکل میں سمگل ہو کر پاکستان آتی تھیں اور پھر پورے پاکستان میں اس کی کاپیاں فروخت ہوتی تھیں۔

میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں جو ادھر جرمن میں بیٹھا اپنی روزی کما رہا ہوں۔ میں یہاں اپنا ذاتی نظریہ لکھ رہا ہوں جو مجھے ویڈیو شاپ والے بتایا کرتے تھے۔ وہی ویڈیو شاپ والے بولتے تھے کہ یہ فلم انڈیا سے سمگل ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ فلمیں لیگل طریقے سے پاکستان میں آتی ہوں مگر مجھے اس بات کا کوئی پتہ نہیں۔ انگلش فلمیں بھی ہندی زبان میں ڈب ہو کر انڈیا سے ہی پاکستان آتی تھیں۔

پاکستان میں زیادہ تر لوگ انڈین فلمیں ہی دیکھتے تھے۔ باقی پاکستان کی مقامی فلمیں پسند کرتے تھے لیکن کچھ سر پھرے ایسے بھی تھے جن کو انگلش فلمیں پسند تھیں۔ جن میں ایک میری چھوٹی بہن ارم اور دوسرا میں تھا۔ ہم دونوں بہن بھائیوں کو انگلش فلمیں ہی دیکھنا پسند تھا۔ آج تو پاکستان اور انڈیا دونوں انگلش فلموں کی بہت بڑی مارکیٹیں بن گئی ہیں اور انگلش فلمیں یہاں پر بہت اچھا بزنس کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے دور میں لوگ زیادہ تر ان پڑھ تھے اور ان لوگوں کو پیار محبت اور دشمنی والی سادہ فلمیں اچھی لگتی تھیں۔ انگلش ایکشن اور ایڈونچر ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ارم اور ایمان اندر کمرے میں فلم دیکھنے لگیں۔ میں ان کے پاس جا کر فلم نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے باہر صحن میں لگے نیم کے درخت کے سائے میں چار پائی پر لیٹ گیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔

میرا دل عجیب وغریب طریقے سے دھڑک رہا تھا۔ ایمان کے نرم گال نشہ دے رہے تھے۔ ایک بار ایمان سے تھپڑ بھی کھا لیا تھا اور ایمان کے تھپڑ کا نشان ابھی تک میرے چہرے پر موجود تھا۔ ایمان نے مجبور ہو کر تھپڑ مارا تھا۔ وہ مجھے ایک اچھا لڑکا سمجھ کر میری طرف بڑھی تھی لیکن میں اچھا لڑکا نہیں تھا۔ مجھے اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ایمان کی ضرورت تھی۔

شکاری اگر شکار کے ذبح ہونے کی تکلیف کو محسوس کرنے لگے تو پھر وہ شکاری نہیں رہتا وہ سبزی خور بن جائے گا۔ مجھے معلوم تھا اگر میں نے مزید دو تین دن اور ایمان کو تنگ کیا تو وہ مجھ سے دوستی کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

گھر میں جب ہم نے چڑیا پکڑنی ہوتی تھی تو اندر کمرے میں گندم کے دانے ڈال کر دروازہ کھول دیتے تھے۔ جب چڑیا دانہ اٹھانے کے لیے کمرے میں جاتی تو دروازہ بند کر کے اندر کمرے میں چڑیا کو چادر سے ڈرا کر اڑانا شروع کر دیتے۔ چڑیا کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلسل اڑتی رہتی۔ ہم چڑیا کو تب

تک اڑاتے رہتے جب تک وہ تھک کر نیچے فرش پر نہ گر جاتی۔ چڑیا زمین پر گرتی تو اسے آرام سے جا کر اٹھا لیتے۔ وہ بے بس ہو کر مزاحمت کے قابل بھی نہ رہتی تھی۔

میں بھی اب ایمان کو اُڑانا چاہتا تھا، اسے تھکانا چاہتا تھا اور جب وہ تھک کر بیٹھ جاتی تو پھر کوئی مزاحمت نہ کرتی۔ تھوڑی دیر تک میں ایمان کے بارے میں سوچتا سوچتا ادھر نیم کے درخت کے نیچے ہی سو گیا۔ چونکہ میں سکول میں استاد سے مار کھا کر آیا تھا۔ اس لیے امی نے بھی مجھے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میں شام تک ادھر ہی سوتا رہا۔

شام کو ابو گھر آئے تو انہوں نے ہی مجھے اٹھایا۔ سکول کے بارے میں تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ارم بھی ایمان کو لے کر باہر صحن میں آ گئی۔ امی نے رات کا کھانا بنا لیا تھا۔ جب دوسرے بھائی کرکٹ کھیل کر گھر واپس آ گئے تو منہ ہاتھ دھو کر سب نے مل کر کھانا کھایا۔ ارم نے چاچا اسلم کا کھانا ٹفن میں پیک کر کے ایمان کو دے دیا۔

اسلم کا کھانا اب ہم ہی بنا دیتے تھے۔ وہ صبح صبح چائے پی کر ایمان کو ہمارے گھر چھوڑ کر کھیتوں پر چلا جاتا اور دوپہر کا کھانا ادھر نمبردار اسے کھیتوں می ہی پہنچا دیتے تھے۔ ایمان صبح صبح ہمارے گھر آ جاتی تھی۔ وہ سارا دن امی کے ساتھ چھوٹے موٹے گھر کے کام کروا دیتی۔ ایمان کے ساتھ امی کا بھی دل لگا رہتا تھا۔ امی ایمان کا خیال بالکل اپنی بیٹی کی طرح رکھتی تھیں۔ ارم کی پچھلے سال کی کتابیں گھر میں ہی پڑی ہوئی تھیں۔ ایمان گجرات میں سکول جاتی تھی۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ امی نے ارم کی کتابیں لے کر ایمان کو گھر میں ہی پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

مجھے کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میں اپنے جیب خرچ کا ایک بڑا حصہ کہانیاں خریدنے پر لگا دیتا تھا۔ ایمان کو بھی آہستہ آہستہ کہانیاں پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ بازار سے جب بھی میں کوئی نیا رسالہ خرید کر لاتا تو اسے سب سے پہلے ایمان، پھر ارم اور آخر میں میں پڑھتا تھا۔

''راضی بیٹا! ایمان کو گھر چھوڑ آؤ۔'' ارم نے کھانا پیک کر کے ایمان کو دے دیا تو ابو نے مجھے کہا۔

''جی ابو جی'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گلی کے اندھیرے سے ایک بار پھر فائدہ اٹھانے کا موقع مل رہا تھا۔

''چلو ایمان!'' میرے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ آ گئی۔

''جی نہیں! آج میں آپ کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے اس پیارے عامر بھائی کے ساتھ جاؤں گی۔'' ایمان نے پیار سے عامر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی باجی! آج میں ایمان باجی کے ساتھ جاؤں گا۔'' عامر نے خوشی سے نعرہ لگاتے ہوئے کہا تو میں آرام سے نیچے بیٹھ گیا۔

چیزیں اگر اتنی آسانی سے مل جائیں تو پھر ان کی وقعت نہیں رہتی۔ خدا کی خدائی کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں۔ ایمان اگر مجھے اتنی آسانی سے مل جاتی تو پھر ہماری کہانی تو ادھر ہی ختم ہو جاتی۔ میں پانچ چھ مہینے ایمان کے ساتھ رہتا۔ اس کے حسین معصوم سراپے سے نکلتا اور پھر یہی حسین و معصوم سراپا بلیک اینڈ وائیٹ ہو جاتا۔ ایمان میری آنکھوں میں اپنی کشش کھو دیتی اور میں کسی اور پھول کی تلاش میں نکل جاتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے میرے دوست وحید نے کیا تھا۔ وہ بھی تو پہلے ایک لڑکی کو چھوڑ چکا تھا اور اب دوسری لڑکی کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ آنے والے کچھ دنوں میں اس نے دوسری لڑکی کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ ایمان مجھ سے دھوکا کھا کر کسی اور شہزادے کا انتظار کر رہی ہوتی جو گلی کراس کر کے اسے اس دیو کی قید سے آزادی دلاتا۔

محبتیں اتنی آسانی سے نہیں ملتیں۔ خدا نے میری قسمت میں ایمان کی محبت لکھی تھی۔ ایک ایسی سچی محبت جو جسموں کے ملن سے بہت اوپر ہوتی ہے۔ اس دنیا میں جو سب سے زیادہ مظلوم ہوتا ہے وہی سب سے زیادہ خدا کے نزدیک ہوتا ہے۔ ایمان مظلوم تھی اور اس مظلوم نے جس شہزادے کے گلی کراس کرنے کی دعا کی تھی وہ میں ہی تھا۔ ایمان کا دل بہت بڑا تھا۔ وہ میری ہر خطا کو معاف کر دیتی تھی۔

''چلو ایمان باجی!'' عامر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور باہر جانے کے لیے چل پڑا۔ میرا آج کا دن ضائع چلا گیا۔ ایمان اپنے گھر چلی گئی تھی اور میں اداس سا ہو گیا۔

دوسرے دن صبح صبح ناشتہ ایمان کے ہاتھ سے ہی کھایا۔ لیکن اس کا غصہ ابھی بھی قائم تھا۔ دوپہر کو میں سکول سے گھر آیا تو ارم کے ساتھ بیٹھ کر بہانے بہانے سے ایمان سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ مجھے یکسر نظر انداز کرتی رہی۔ وہ میری ہر بات کا سادہ سا جواب دیتی اور پھر دوبارہ ارم سے باتیں کرنے میں

مشغول ہوجاتی۔سکول کی باتیں،کام کی باتیں اور گھر کی باتیں۔۔۔۔۔وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتی جارہی تھیں اور میں بے وقوفوں کی طرح ان کے منہ دیکھ رہا تھا۔

میں ایمان کے دل میں اپنی جگہ بنانے میں ناکام ہوگیا تھا۔اس نے میری خواہش کرنا چھوڑ دی تھی۔اپنی حرکتوں کی وجہ سے شاید میں نے ایمان کو کھودیا تھا۔شاید اسے کوئی اور لڑکا پسند آ گیا ہو،شاید وہ کسی اور لڑکے سے دوستی کرنے کے چکر میں ہو یا شاید ایمان ایک بری لڑکی ہے۔میرے ذہن میں عجیب وغریب منفی خیالات آ رہے تھے اور یہی سوچتا میں گھر سے باہر نکل گیا۔

شام تک میں یونہی بے مقصد گلیوں میں آوارہ گھومتا رہا۔شام کو گھر آیا اور جلدی جلدی کھانا کھا کر باہر نکل گیا اور گلی کے اندھیرے میں کھڑا ہوکر ایمان کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔میرے ہاتھ میں ایک روپے کا نوٹ تھا۔مجھے معلوم تھا کہ ایمان کبھی بھی میرے ساتھ باہر نہ جاتی۔وہ آج بھی عامر کو ساتھ لے کر گھر جاتی۔اس لیے میں پہلے ہی باہر آ کر ایمان کا انتظار کرنے لگا۔

ایک روپیہ میں نے عامر کے لیے پکڑا ہوا تھا۔میں اسے ایک روپیہ دیتا تو وہ دکان پر قلفی کھانے کے لیے ایمان کو گلی میں ہی چھوڑ کر چلا جاتا۔میرا آج ایمان سے زبردستی کرنے کا ارادہ تھا۔نا نو یار! لڑکی چاہے جتنی بھی بہادر ہو اگر رات کو اس کا ہاتھ پکڑ لو تو وہ کبھی بھی شور نہیں مچاتی۔اسے اپنی بدنامی کا ڈر رہتا ہے۔میں اپنا دل مضبوط کرنے لگا۔مجھے گلی میں انتظار کرتے ہوئے ابھی آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا جب ہمارے گھر کا دروازہ کھلا اور عامر ایمان کے ساتھ باہر آ گیا۔

''راضی بھائی! آپ باہر کیوں کھڑے ہو؟'' گلی بالکل سنسان تھی،ایمان مجھے باہر دیکھ کر ڈر گئی۔

''یار گھر میں گرمی لگ رہی تھی اس لیے تازہ ہوا لینے کے لیے باہر آ گیا۔یہ لو تم ایک روپیہ اور دکان سے جا کر قلفی لے کر کھالو،ایمان کو میں چھوڑ آتا ہوں۔'' میں نے ایک روپیہ اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی! میں ایمان باجی کو گھر چھوڑ کر پھر دکان پر چلا جاؤں گا۔'' اس نے ایک روپیہ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں!تم جاؤ! میں چھوڑ دوں گا تمہاری ایمان باجی کو۔'' میں نے تھوڑا غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن بھائی! وہ ابھی۔۔۔'' عامر اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایمان نے اسے درمیان سے روک دیا۔

''عامر! تم جاؤ دکان پر، میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' اس نے میرا نام لینے سے گریز کیا۔

''ٹھیک ہے باجی۔'' عامر نے ہم دونوں کو ادھر ہی چھوڑا اور دکان کی طرف بھاگ گیا۔

''چلیں!'' ایمان نے مجھے کہا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی اور میں خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ہم نے خاموشی سے گلی کراس کی اور ایمان کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔

''ایمان!'' میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی۔

وہ خاموشی سے مڑی اور میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کی کلائی ابھی بھی میرے ہاتھ میں تھی جسے اس نے بالکل چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

''جی! کیا بات ہے؟'' وہ میری میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ایمان! میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، پلیز! مجھ سے دوستی کر لو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا ایمان!'' میں ایک سانس میں ہی بولتا چلا گیا۔

میں خاموشی سے اب اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی چہرہ تھا جو کل تک میری دسترس میں تھا۔ جسے میں نے اپنے ہاتھوں میں تھاما تھا۔ اسی چہرے کے ایک ایک حصے کو میں نے اپنی انگلیوں سے چھوا تھا۔ آج وہ مجھ سے بہت دور ہو گیا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹ میرے سامنے تھے لیکن میں ان کو چھو نہیں سکتا تھا۔ اپنے لالچ کی وجہ سے میں نے ان ہونٹوں پر اپنا حق کھو دیا تھا۔

''ایمان پلیز! مجھ سے دوستی کر لو۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔ میرا سر ندامت سے جھک گیا، میں اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا تھا۔

''راضی! دوستی تو میں نے تجھ سے پہلے دن ہی کر لی تھی۔ دوست تو تم پہلے دن سے ہی میرے بن گئے تھے لیکن شاید میں نے غلط لڑکے کو دوستی کے لیے چن لیا ہے۔ ہاں راضی! تم اچھے لڑکے نہیں ہو۔ تم بہت برے لڑکے

ہو لیکن یقین کرو راضی! میں غلط لڑکی نہیں ہوں۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ شاید میں تمہاری خواہشات کو پورا نہ کر سکوں۔ راضی پلیز!'' میرے ہاتھ سے اس کی کلائی چھوٹ گئی تھی۔ رات کی اس تاریکی میں ایمان کے گھر کے سامنے اس وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

''راضی!'' وہ ایک ہاتھ بڑھا کر میرے گالوں کو چھونے لگی۔ صورت حال تبدیل ہو گئی تھی۔ آج وہ میرے چہرے پر ہاتھ رکھے اسے نرمی سے سہلا رہی تھی۔

''راضی!'' اس نے آہستگی سے مجھے پکارا تو میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہی سفید چہرہ، وہی ہلکی سبز آنکھیں جو پچھلے چار پانچ دنوں سے مجھے تڑپا رہی تھیں۔ آج ان آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا تھا۔

''راضی!'' وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''راضی! میں بہت مظلوم ہوں۔ ان چار پانچ دنوں میں جو درد اور جو اذیت میں برداشت کر رہی ہوں اس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم ابھی بچے ہو اس لیے شاید ان اذیتوں کو نہ سمجھ سکو۔ بچی تو میں بھی ہوں راضی! لیکن میں ان اذیتوں سے گزر رہی ہوں۔ یہ درد سہتے سہتے میں تھک گئی ہوں، میں مر جاؤں گی یہ درد سہتے سہتے۔ پلیز! میرے حال پر رحم کرو۔ میں تم کو کچھ نہیں دے سکتی، تمہارے گھر میں سکون کی تلاش میں آتی ہوں۔ ہر رات میں اس بوڑھے کے بستر پر کسی لاش کی طرح پڑی ہوتی ہوں۔ میں تو شاید کب کی مر جاتی لیکن تمہارے گھر والوں کی سچی اور بے لوث محبت مجھے واپس زندگی کی طرف لے آتی ہے۔ پلیز راضی! میں پہلے ہی زخموں سے چور چور ہوں، مجھے مزید زخم مت دو۔ مجھے معاف کر دو یار! مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے جو میں دو دو محاذوں پر لڑ سکوں۔ مجھے معاف کر دو راضی!'' اس نے روتے ہوئے میرے آگے ہاتھ باندھ لیے۔

وہ سبز آنکھوں والی معصوم سی لڑکی میرے سامنے ہاتھ جوڑے رو رہی تھی۔ انسان جب درد سے ٹوٹ جاتا ہے تو رونے لگ جاتا ہے۔ وہ لڑکی بھی رو رہی تھی۔

واہ رے رضوان علی! آج تو نے ایک ننھی سی پری کو رلا دیا۔ میں نے زندگی میں بہت غلط کام کئے تھے لیکن کبھی کسی شخص کا دل نہیں دکھایا تھا۔ آج پہلی بار میری وجہ سے اس لڑکی کا دل دکھا تھا۔ اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے میں اس حد تک گر گیا تھا کہ اسے مجھ سے اپنی عزت کی بھیک مانگنی پڑ گئی تھی۔ وہ جینا چاہتی

تھی۔

واہ رے رضوان! تو کتنا بے شرم ہے!'' میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا اور ایمان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

کچھ دیر پہلے میری آنکھیں اور دماغ ہوس سے بھرا ہوا تھا مگر اب اس کی جگہ ندامت اور شرمندگی نے لے لی تھی۔ مجھے ہوش آ گیا تھا، جانے انجانے میں میں بہت بڑی غلطی کر بیٹھا تھا۔

''سوری ایمان! مجھ سے غلطی ہو گئی، میں تم کو غلط سمجھ بیٹھا، مجھے معاف کر دینا ایمان! میں برا لڑکا نہیں ہوں۔'' میری آواز میرے گلے میں اٹک رہی تھی۔ ایمان کے ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھے۔ وہ اب بھی رو رہی تھی۔

''ایمان! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری وجہ سے تمہیں اس قدر دکھ ہو گا۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں کبھی بھی تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔'' میری آواز بھرّا گئی۔

میں نے ایمان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میری امی کہتی تھیں؛

''نانو! تمہارا دل بہت سخت ہے، تمہیں کبھی بھی رونا نہیں آتا۔''

یہ حقیقت تھی کہ میں بڑی سے بڑی چوٹ لگنے پر بھی کبھی نہیں روتا تھا۔ شاید مجھے رونا آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن آج ایمان سے معافی مانگتے مانگتے اور ایمان کو چپ کرواتے کرواتے میں خود بھی رو پڑا تھا۔

''ایمان! مجھے معاف کر دینا۔'' میں نے ایمان کے ہاتھ چھوڑے تو اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ گلی میں ہم دونوں ایک دوسرے کو سینے سے لگائے رو رہے تھے۔

''راضی! بہت درد ہوتا ہے یار! ہر رات ایک نئے عذاب سے گزرتی ہوں۔ تم نہیں سمجھو گے، تم شاید سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جلدی سے بڑے ہو جاؤ یار! اس سے پہلے کہ شہزادی مر جائے۔''

وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں نے میری ساری قمیض تر کر دی تھی۔ میں اسے گلے سے لگائے اس کی کمر تھپتھپا کر اسے حوصلہ دے رہا تھا۔

''ایمان! تم حوصلہ رکھو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی تو اس کے رونے میں تھوڑی کمی آ گئی۔ کچھ دیر رونے کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ میرے سینے کی حرارت نے شاید اس کے دل کے غبار کو ختم کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اب پرسکون ہو گئی تھی۔

''راضی یار! کبھی دھوکہ مت دینا۔'' وہ میرے سینے سے علیحدہ ہو کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

''ایمان! مجھے معاف کر دینا! میں نے واقعی غلط کیا ہے، مجھے یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے۔'' میں ایک بار پھر اس سے معافی مانگنے لگا۔

''شاید میں بہت برا ہوں ایمان!'' مجھے ندامت محسوس ہو رہی تھی۔

''نہیں راضی! تم بہت اچھے ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکا ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا اور وہ کبھی بھی میرے جزباتوں کو نہ سمجھ سکتا۔ تم اچھے ہو یار جو میرے جذباتوں کو سمجھ سکتے ہو۔ میں بہت خوش قسمت ہوں جو مجھے تم جیسا دوست ملا۔'' اس نے پیار سے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور دوبارہ اپنے روایتی موڈ میں آ گئی۔

''تو کیا تم نے مجھے اپنا دوست بنا لیا ہے؟ کیا آج سے ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں؟'' میں خوشی سے جھوم اٹھا۔

''ہاں یار! آج سے تم میرے پکے دوست ہو۔'' وہ ابھی تک میرے بالوں سے کھیل رہی تھی۔

''ابھی دوستی کا کوئی تحفہ وغیرہ چاہیے تو بولو! آج تمہارے سامنے پوری کی پوری ایمان کھڑی ہے۔ دیکھ لو اگر سینے پر ہاتھ لگانا چاہتے ہو لگا لو، میں تم کو منع نہیں کروں گی۔'' وہ میرے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے ایک نظر اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ لگا کر تھپڑ کھایا تھا۔ کل تک میں اس چیز کے لیے مر رہا تھا لیکن آج جب وہ خود پوری کی پوری میرے سامنے کھڑی تھی تو مجھے اس کے سینے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

''نہیں ایمان! مجھے کچھ نہیں چاہیے، میں صرف تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ ایک سچی اور پکی دوستی کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''مجھے معلوم تھا راضی! سیالکوٹیے اتنے بھی برے نہیں ہوتے۔'' اس نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''اچھا! تو اس کا مطلب ہے ہم برے تو ہوتے ہیں لیکن کم برے ہوتے ہیں۔'' میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا تو وہ خوشی سے مسکرانے لگی۔ ماحول ایک دم خوشگوار ہو گیا تھا۔

''اچھا یار! اب میں چلتی ہوں! بہت دیر ہو گئی ہے، اندر اسلم انتظار کر رہا ہوگا۔'' اس نے دوروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ایمان سوری یار!'' میں نے اس سے ایک بار پھر معذرت کی تو وہ واپس پلٹی اور مجھے دوبارہ گلے سے لگا لیا۔ دو تین منٹ تک ہم ایسے ہی ایک دوسرے کے گلے لگے رہے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے علیحدہ ہوئی اور دروازہ کھول کر اپنے گھر چلی گئی۔

میری اور ایمان کی دوستی اگلے دو سال تک ایسے ہی چلتی رہی۔ میں مڈل سکول سے ہائی سکول میں آ گیا۔ ایمان بارہ سال کی اور میں چودہ سال کا ایک نوجوان بن گیا تھا۔ میری مونچھوں پر ہلکے ہلکے بال آنے لگ گئے تھے۔ میں اور ایمان دونوں ہی جوان ہو چکے تھے۔ ایمان پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔

میری اور ایمان کی دوستی ابھی تک ایک دوسرے کو گلے لگانے تک محدود تھی۔ دو سال پہلے ایمان سے دوستی کرتے ہوئے جو وعدہ کیا تھا وہ وعدہ میں بھولنے لگ گیا تھا۔ دو سال سے میں نے اور ایمان نے ایک ساتھ وقت گزارا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے لیکن میں دوستی سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ مجھے ایمان سے کچھ اور بھی چاہیے تھا۔

میری سوچ کا زاویہ تھوڑا بدلا تو میں ایمان کو دوسری نگاہ سے دیکھنے لگا۔ میں بہانے بہانے سے ایمان کے جسم کے مختلف حصوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ میں جان بوجھ کر اسے اپنے مقصد کے لیے تیار کرنے لگا۔ ایمان نے میری حرکتوں کو محسوس کر لیا تھا۔ چونکہ ہماری دوستی کو دو سال ہو گئے تھے اور ایمان اس دوستی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے وہ جان بوجھ کر انجان بنی رہتی۔

ان دنوں ہمارے گاؤں میں چوریاں بہت بڑھ گئیں تھی۔ گاؤں کے چار پانچ گھروں میں چوریاں ہوئیں تو گاؤں والوں نے مل کر پہرہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ ہر روز پانچ گھروں سے ایک ایک آدمی رات کو پہرہ

دیتا۔ ہمارے گاؤں میں تقریباً ۴ سو گھر تھے۔ اس طرح تین مہینے کے بعد ایک گھر کی باری آتی، اس گھر کا کوئی ایک فرد ساری رات پہرہ دیتا تھا اور اس طرح چوریوں پہ کنٹرول ہو گیا تھا۔

آج نمبر داروں کے گھر کی باری تھی تو انہوں نے اپنی جگہ پر اسلم کو رات پہرے پہ لگا دیا۔ وہ پہرے پر چلا گیا تو ایمان گھر میں اکیلی ہو گئی تھی۔ ابو نے مجھے ایمان کے گھر بھیج دیا۔

''بیٹا! تم ایمان کے پاس ہی ٹھہر جاؤ، صبح جب اسلم آ جائے تو واپس آ جانا۔'' میں ایمان کو لے کر اس کے گھر آ گیا۔ آج رات اسلم پہرے پر تھا اور گھر میں ایمان اور میں دونوں اکیلے تھے۔

''ایمان! ادھر میرے پاس آ جاؤ! اکٹھے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' میں نے ایمان کو کہا۔ وہ دوسری چارپائی پر آ کر لیٹ گئی تھی۔

''نہیں یار! تم سو جاؤ، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ صبح تم نے سکول بھی جانا ہے، سکول سے واپس آؤ گے تو پھر باتیں کریں گے۔'' ایمان نے بہانہ بنایا، وہ میرے پاس آنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ خدا نے عورتوں کو بہت حساس بنایا ہے۔ انہیں وقت سے پہلے ہی حالات کا پتہ چل جاتا ہے۔

''یار ایمان آ جاؤ نا! دس منٹ پھر تم سو جانا۔'' میں نے دوبارہ ایمان کو آواز دی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اپنی چارپائی پر لیٹی رہی۔

''ٹھیک ہے ایمان! اگر تم نہیں آنا چاہتی تو میں تمہاری چارپائی پر آ جاتا ہوں۔'' میں اپنی چارپائی سے اٹھا اور ایمان کی چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔

''ایمان! کیا بات ہے تم مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی ہو؟'' میں نے اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

وہ آنکھیں بند کئے خاموشی سے میری گود میں لیٹی رہی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے بالوں سے کھیلتا ہوا اس کے چہرے پر آ گیا اور پھر پیار سے اس کے گالوں کو سہلانے لگا۔ میں ایک ہاتھ سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اور دوسرا ہاتھ اس کے چہرے اور گردن پر پھیرنے لگا۔ اب میرے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے گلابی

ہونٹوں پر چل رہی تھیں۔

مجھے آج سے دو سال پہلے کا زمانہ یاد آ گیا۔تب بھی شروعات چہرے سے ہی ہوئی تھی اوراس کے بعد میں سینے پر آ گیا تھا۔ارادہ آج بھی سینے سے ہوتا ہوا کہیں دور جانے کا تھا۔اس وقت تو ایمان نے مجھے تھپڑ مار کر روک دیا تھا لیکن آج وہ تھپڑ مارنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔آج وہ دوستی بچانے کے چکر میں لگی ہوئی تھی۔دوسال کی مضبوط دوستی پل بھر میں ختم ہونے والی تھی۔

چہرے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اوراسے دباتا چلا گیا۔ایک لمحے کے لیے ایمان گھبرائی اور پھر غصے سے مجھے گھورنے لگی۔

''راضی پلیز! مجھے چھوڑ دو! میں یہ سب کچھ نہیں کرسکتی۔'' اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اوران آنکھوں میں ایک التجا تھی۔

میں اپنے کام میں مصروف رہا، میرے ذہن پراس وقت صرف ایک ہی دھن سوار تھی اور میں اسی پر عملدرآمد کررہا تھا۔میرے ہاتھ ایمان کے سینے پر تھے اور میں پیار سے اسے مسلتا جارہا تھا۔

جب انسان کے ذہن پر ہوس سوار ہوتی ہے تو چہرے کی خوبصورتی ثانوی ہوجاتی ہے۔ایمان کا چہرہ بھی میری نظروں سے محو ہو گیا تھا۔میرا ہاتھ ایمان کے سینے سے ہوتا ہوااس کے پیٹ پر جا پہنچا۔اس کا جسم کپکپانے لگا۔اچانک اس نے میرے ہاتھ کو اپنے پیٹ سے ہٹایا اور چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''رضوان! تم اپنے گھر چلے جاؤ۔'' ایمان جب غصے میں ہوتی تھی تو وہ مجھے میرے اصل نام سے بلاتی تھی۔

''نہیں! میں نہیں جاؤں گا۔'' میں اپنی جگہ پراَڑ گیا۔

''دیکھو! اگرتم ابھی میرے گھر سے نہیں گئے تو میں شور مچا کر پورے محلے کو اکٹھا کرلوں گی۔'' وہ دوسال پہلے والی ایمان بن گئی تھی۔

''جو کرنا ہے کرلو! لیکن آج میں یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔''

مجھے معلوم تھا اگر میں ایک بار اس گھر سے نکل گیا تو پھر کبھی بھی ایمان کو حاصل نہ کر سکوں گا۔ مجھے ایمان چاہیے تھی ہر حالت میں اور مجھے اس بات کا فیصلہ ہوئے بغیر اس گھر سے نہیں جانا تھا۔

''تم آج بھی نہیں بدلے رضوان! میری دو سال کی دوستی بھی تم کو نہ بدل سکی۔ پتہ نہیں تم کس مٹی کے بنے ہوئے ہو؟ پتہ نہیں سینے کے اندر کون سا پتھر لیے بیٹھے ہو تم جو کسی چیز کا اثر ہی نہیں ہوتا تم پر! کسی کے جذباتوں سے کے کھیل کر پتہ نہیں کون سا مزا آتا ہے تمہیں!''

وہ اونچی اونچی آواز میں بولنا شروع ہوگئی۔ اس کی آواز کمرے سے باہر جا رہی تھی۔ مجھے ڈر لگنے لگا، اگر وہ اسی طرح زور زور سے بولتی رہتی تو محلے سے کوئی نہ کوئی اٹھ کر آجاتا۔

''ایمان! ایک منٹ، میری بات تو سنو!'' میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر ہلایا لیکن وہ تو ہوش و حواس کی دنیا سے باہر جا چکی تھی۔

''دفع ہو جاؤ میرے گھر سے! مجھے تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنی! آج کے بعد کبھی شکل مت دکھانا۔'' وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

''ایمان پلیز! دیکھو ایک بار! میں جا رہا ہوں تم چپ ہو جاؤ بس!'' میں جلدی جلدی جوتے پہننے لگا۔

''چلے جاؤ بے غیرت انسان! تم دوستی کے قابل ہی نہیں ہو۔ تمہارے لیے عورت صرف ایک ہی مقصد کے لیے بنی ہے۔'' اس نے چارپائی کے نیچے پڑا ہوا جگ اٹھایا اور پوری طاقت سے میری طرف اچھال دیا۔

میں ایک جوتا پہن چکا تھا۔ میں نے دوسرا جوتا ہاتھ میں پکڑا اور اس کے گھر سے بھاگ کر باہر آگیا۔ گلی میں آکر میں نے دوسرا جوتا پہنا اور چپ چاپ اپنے گھر چلا گیا۔

آج ایک بار پھر میں ایمان کو کھو چکا تھا۔ آج پھر میں غلطی کر بیٹھا تھا۔ میں آدم کی اولاد میں سے تھا اور شیطان نے مجھے ایمان کی جنت سے نکلوا دیا تھا۔ میں بار بار غلطی کرتا تھا اور میرے اندر کا حیوان بار بار باہر نکل آتا تھا۔ میں ایمان کی پاکیزگی اور اس کی پاکدامنی کا لٹیرا بن گیا تھا۔

دوستی ختم ہو چکی تھی۔ ایمان کے دل سے پہلے بھی ایک بار نکل چکا تھا لیکن اس بار درد زیادہ ہوا تھا۔ ایمان

کے ساتھ دو سال سے رہتے رہتے مجھے اس کی عادت ہوگئی تھی۔ میں گھر آ کر ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے لیکن جب کسی کا دل ٹوٹتا ہے تو پھر نیند نہیں آتی۔ میرا اور ایمان ہم دونوں کا ہی دل ٹوٹا تھا۔ ہم دونوں آج رات اپنے اپنے گھروں میں نیند سے لڑ رہے تھے۔ ہم دونوں ہی رو رہے تھے اور غلطی آج بھی میری ہی تھی۔

''ایمان! مجھے معاف کر دینا۔'' میں ساری رات خیالوں میں ہی ایمان سے معافی مانگتا رہا۔

ایمان مجھ سے چھوٹی ضرور تھی لیکن وہ زمانے کے ستم سہتے سہتے بہت بہادر ہوگئی تھی۔ وہ تو غم کے اس پہاڑ کو برداشت کر گئی لیکن میں بہت کمزور تھا۔ پوری رات لڑتے لڑتے میں ہار گیا۔ صبح تک میں بخار سے تپ رہا تھا۔ میرا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا اور ذہن پر بار بار غنودگی چھا رہی تھی۔ لیکن میں بیہوش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے ہوش میں رہ کر اس درد کو سہنا تھا اور میں ہوش میں تھا۔

صبح جب ارم مجھے جگانے کے لیے آئی تو میری حالت دیکھ کر ڈر گئی۔ ایک رات کے بخار نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ پل بھر میں ہی پورا گھر اکٹھا ہو گیا تھا۔

''خدا کی پناہ! یہ تو تپ رہا ہے بخار سے۔۔۔ اتنا زیادہ بخار، اس کے ماتھے پر تو ہاتھ بھی نہیں لگایا جاتا۔'' ابو میرے ماتھے پر ہاتھ لگا رہے تھے۔

اس زمانے میں تھرمامیٹر اتنے عام نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے گھروں میں بخار کی شدت کا اندازہ ماتھے پر ہاتھ لگا کر ہی کیا جاتا تھا۔

''طارق بیٹا! جاؤ ڈیرے سے گدھا گاڑی لے آؤ، اسے اڈے پر لے جاتے ہیں کسی ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے۔''

ہسپتال تو ہمارے گاؤں سے تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر دور بہاولپور شہر میں واقع تھا۔ لیکن گاؤں سے دو کلومیٹر دور اڈے پر ایک چھوٹا سا پرائیویٹ کلینک تھا جہاں ایک غریب سا ڈاکٹر سو دو سو روپے لے کر بخار اور سر درد وغیرہ کی دوائی دے دیتا تھا۔

''جاؤ طارق بیٹا! جلدی سے گدھا گاڑی لے آؤ، راضی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔'' ابو نے طارق بھائی سے کہا تو وہ باہر جانے کے لیے مڑے لیکن میں ان کی کلائی پکڑ لی۔

''نہیں ابو! آپ کام پر جاؤ، مجھے ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔ شام تک میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' میں نے ابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے معلوم تھا میرے اس بخار کی دوائی ڈاکٹر کے پاس نہیں تھی۔ ابو کا فضول میں دو تین سو روپیہ بھی ضائع ہو جاتا اور ان کی چھٹی کی وجہ سے ڈیرے پر بھی اچھا خاصا نقصان ہو جاتا۔

''دیکھ لو بیٹا! اگر تم ٹھیک محسوس نہیں کر رہے تو میں چلا جاتا ہوں، تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں؟'' ابو نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میرا ماتھا ابھی بھی بخار سے تپ رہا تھا۔ غربت چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ ابو کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ میں اگر آج ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا تو آنے والے ایک ہفتے تک ہمارے گھر کا بجٹ بہت بری طرح بگڑ جاتا۔ انہیں اپنے پانچ پانچ بچوں کا پیٹ پالنا تھا۔ وہ ڈاکٹروں والی عیاشی افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹے کی بیماری سے زیادہ انہیں بچوں کے پیٹ پالنے کی فکر تھی۔

''عامر بیٹا! تم جا کر اپنی ایمان باجی کو لے آؤ، آج اسلم گھر پر ہی ہوگا تو ایمان نہیں آئے گی۔ تم ان کو میرا بتانا! انہیں کہنا کہ راضی کی طبیعت بہت خراب ہے اس لیے ابا نے ایمان کو بلایا ہے۔ وہ دو تین گھنٹے راضی کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ دے۔ راضی کی طبیعت تھوڑی ٹھیک ہو جائے تو وہ واپس اپنے گھر چلی جائے۔'' عامر بھاگ کر گیا اور تھوڑی دیر بعد ایمان کو اپنے ساتھ لے کر آ گیا۔

''جی چاچو! کیا ہو گیا راضی کو؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے آتے ہی میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

برف کی طرح ٹھنڈا یخ ہاتھ، ایک لمحے میں ہی ٹھنڈک کا احساس میری روح کی گہرائیوں تک جا پہنچا۔ میری طبیعت سنبھلنے لگی، بخار کا زور ٹوٹنے لگا تو میں نے آنکھیں کھول کر ایمان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ میری

طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

ساری رات رو رو کر اس کی آنکھیں لال سرخ ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کا ہلکا سبز پن غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ سرخی نے لے لی تھی۔ شاید وہ بھی ساری رات سے جاگ رہی تھی۔ وہ میرے ہاتھ سے زخم کھا کر میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں زخم دے کر اسے برداشت نہ کر سکا تھا مگر وہ زخم کھا کر بھی اسے برداشت کر گئی تھی۔ خدا نے عورتوں کو بہت مضبوط بنایا ہے یا پھر اس خدا نے ایمان کو بہت مضبوط بنا دیا تھا۔

''ایمان بیٹی! تم راضی کے ماتھے پر برف کی ٹھنڈی پٹیاں رکھ دو اس کا بخار کم ہو جائے گا۔'' میرے باقی بھائیوں کو سکول سے دیر ہو رہی تھی اس لیے وہ جلدی جلدی سکول چلے گئے۔

''آج ڈیرے پر کام بہت زیادہ ہے اس لیے میں اور تمہاری چاچی ڈیرے پر جا رہے ہیں۔ تم دو تین گھنٹے تک اپنے گھر چلی جانا، تب تک میں تمہاری چچی کو گھر بھیج دوں گا۔''

''نہیں چچا! آپ آرام سے جاؤ، اسلم ابھی شہر چلا گیا ہے، اس کی واپسی اب رات کو ہی ہو گی۔ میں رات تک ادھر راضی کے پاس ہی ہوں، آپ کام ختم کر کے ہی گھر واپس آنا۔'' ایمان مجھے راضی کہہ کر بلانے لگی۔

مجھے بخار میں تپتا ہوا دیکھ کر اس کا غصہ اتر گیا تھا۔ ایمان تھی ہی ایسی، اس نے ہر پل ہر جگہ میری ہر اس خطا کو معاف کیا جو جانے انجانے میں مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم کھانا کھا لو اور راضی کو بھی تھوڑا کھلا دینا۔'' امی نے میرے چہرے پر ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''جی خالہ جی! میں کھلا دوں گی، آپ بے فکر رہو۔''

''ٹھیک ہے بیٹا! میں ماں ہوں مجھے فکر تو ہو گی نا۔'' امی نے ایمان کو کہا اور ابو کے ساتھ ڈیرے پر چلی گئی۔

گھر میں مَیں اور ایمان اکیلے ہو گئے تھے۔ ایمان دوسرے کمرے سے پلاسٹک کے چھوٹے برتن میں برف اور ماتھے پر رکھنے کے لیے پٹیاں لے آئی۔ اس نے میرے سرہانے کی طرف لکڑی کا سٹول رکھا اور اس پر پلاسٹک کے برتن کو رکھ دیا۔ وہ میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی اور برف والے پانی سے پٹیاں بھگو بھگو کر میرے ماتھے پر رکھنا

شروع کر دیں۔

پتہ نہیں وہ برف کی ٹھنڈک تھی یا ایمان کا میرے ساتھ بیٹھنا، مجھے بہت سکون محسوس ہونے لگا۔ ایمان تقریباً دس منٹ تک خاموشی سے میرے ماتھے پر پٹیاں رکھتی رہی۔ میرا بخار مکمل طور پر اتر گیا تھا۔ وہ بس خاموشی سے پٹیاں رکھ رہی تھی۔ رات کو ایک طوفان آیا تھا اور گزر گیا۔ صرف ایمان کے دل میں وہ طوفان ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ نازک سی لڑکی پتہ نہیں کون کون سے طوفان چھپائے بیٹھی تھی۔

''ایمان! میں اب ٹھیک ہوں، تم پٹیاں کرنا چھوڑ دو۔'' میں نے ایمان سے کہا تو اس نے پٹیاں کرنا چھوڑ دیں اور اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر میرا ماتھا خشک کرنے لگی۔

''تم تھوڑا بیٹھنے کی کوشش کرو تو میں تمہارے لیے کھانا لا دیتی ہوں۔'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''جی جی! مجھے بھی ابھی تھوڑی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے ایک ہاتھ میرے سر کے پیچھے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے میری کلائی پکڑ کر مجھے بٹھانے لگی۔

''تم آرام سے بیٹھو! میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔'' اس نے مجھے آرام سے بٹھاتے ہوئے کہا اور باہر کھانا لانے چلی گئی۔

میں کمرے میں اکیلا رہ گیا اور مجھے اپنے کئے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ شاید میں نے ایمان سے زیادتی کی ہے، مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ لیکن یہ احساس بس تھوڑی دیر ہی رہا۔ ایمان ایک منٹ بعد ہی کھانا لے کر آ گئی تو میں سوچوں کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ وہ میرے سامنے میری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کھانے کی ٹرے اس نے اپنی گود میں رکھ لی اور کھانے کا ایک چھوٹا سا نوالہ لے کر میرے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

''نہیں ایمان! میں اب ٹھیک ہوں، میں اپنے ہاتھ سے کھانا کھا لوں گا۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے نوالہ لینا چاہا تو اس نے اپنے نوالے والے ہاتھ کو مجھ سے دور کر لیا۔

''آج میرے ہاتھ سے کھانا کھاؤ راضی!'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پتہ نہیں کیا بات تھی ان سبز آنکھوں میں کہ مجھے ان آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکی اور میں نے اپنی

آنکھیں جھکا لیں۔

''میرے ہاتھ سے کھانا کھالو راضی!'' اس نے دوبارہ میرے منہ کی طرف نوالہ بڑھایا تو میں نے خاموشی سے نوالہ منہ میں ڈال لیا۔

وہ خاموشی سے نوالے بنا بنا کر میرے منہ میں ڈالتی رہی اور میں کھاتا رہا۔ وہ کچھ بھی نہیں بول رہی تھی۔ میرا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ کچھ بولے، چاہے مجھے برا بھلا کہے، اس سے اس کے دل کا غبار بھی ہلکا ہو جاتا۔ مگر اس نے جیسے نہ بولنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسی طرح اندر ہی اندر زخم سہہ کر خاموش رہتی تو شاید مر جاتی۔

میں اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن جتنی میں نے غلطیاں کی تھیں مجھے تو اب معافی مانگتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔ بہر حال پھر بھی مجھے معافی تو مانگنی تھی۔ اگر میں اس سے معافی نہ مانگتا تو شاید میں خود مر جاتا۔ مجھے ہر صورت معافی مانگنا تھی۔

''ایمان! میں نے اس کے ہاتھ سے نوالہ لے کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔''

''تھوڑا اور کھا لیتے!'' اس نے نارمل لہجے میں کہا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھ سے ہاتھ چھڑانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔

''ایمان!'' میری آواز رُندھ گئی۔ مجھ سے مزید کچھ اور نہیں بولا گیا۔

''مزید کھانا کھاؤ گے؟'' اس نے مجھ سے مزید کھانے کا پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میرا مزید کھانا کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! میں کھانا واپس رکھ دیتی ہوں۔'' وہ ٹرے پکڑ کر کھڑی ہوئی تو میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

ویسے بھی اس کا ہاتھ پکڑنے کا حق میں نے کھو دیا تھا۔ میرے اندر اتنی طاقت بھی نہیں تھی۔ ایمان ٹرے پکڑ کر دروازے کی طرف چلی تو میں نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

'جی کوئی اور چیز چاہیے تو بولو؟ میں لا دیتی ہوں۔'' اس نے پیچھے مڑ کر کہا تو میں نے خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

وہ باہر جا کر برتن دھونے لگ گئی۔ برتن دھونے کے بعد اس نے رات کو پکانے کے لیے سبزی وغیرہ بنا دی تھی تا کہ امی آئے تو وہ ساتھ مل کر رات کے لیے کھانا بنا لیتی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دودھ گرم کر کے لے آئی۔

''راضی! دودھ پی لو! صرف ایک رات کے بخار سے ہی تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔'' اس نے دودھ کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور اپنے تکیئے کی طرف پڑے ہوئے سٹول پر رکھ دیا۔ وہ میری چار پائی کے سرہانے کھڑی تھی۔

''ایمان! دو منٹ میرے پاس بیٹھ جاؤ!'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اگلے ایک منٹ تک وہ ایسے ہی مجھے دیکھتی رہی۔

''ایمان!'' میں نے ایک بار پھر اسے پکارا تو وہ ایک گہری سانس لے کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا اور میں اس کے ہاتھ کو سہلانے لگا۔

''ایمان! مجھے تم سے معافی مانگتے ہوئے شرم تو بہت آ رہی ہے مگر میں تم سے معافی ضرور مانگوں گا۔ شاید اب کی بار تم مجھ کو معاف کر دو۔ ایمان! میں آج کے بعد کبھی اس دوستی کی حد کو کراس نہیں کروں گا۔ میں نے زندگی میں ہمیشہ تمہاری دل سے عزت ہی کی ہے بس کبھی کبھی میں بھٹک کر کسی اور راستے کا مسافر بن جاتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔ تمہارے دل میں شاید اب بھی میرے لیے تھوڑی عزت تھوڑا اعتبار باقی ہے۔ شاید دوستی اب بھی باقی ہے۔'' میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور میرے ہاتھوں کی لرزش بہت بڑھ گئی تھی۔

''پلیز ایمان! ایک بار معاف ضرور کر دینا۔'' میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور التجائیہ نظروں سے ایمان کی طرف دیکھنے لگا۔

''راضی!'' وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے دوسری بار میرا نام لیا تھا لیکن میرے نام سے آگے وہ خاموش تھی۔ شاید دل میں کچھ کہنے کا حوصلہ پیدا کر رہی تھی۔ یہ خاموشی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی۔ وہ خاموشی

سے بس میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

''ایمان! کچھ تو کہو!'' اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا۔

''ایمان! کچھ تو بولو! مجھے گالیاں دے لو، برا بھلا کہہ لو مگر یوں خاموش نہ رہو۔ پلیز ایمان! کچھ تو۔۔۔'' میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا اور رونے لگ گیا۔

''راضی!'' اس نے میری آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو ہاتھ کی ہتھیلی سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''راضی!'' وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور پھر گویا ہوئی؛

''آج رات میں بیرونی دروازہ کھلا رکھوں گی، تم میرے جانے کے بعد آدھے گھنٹے کے بعد چوری سے گھر میں داخل ہو جانا۔ ہمارے کمرے کے دروازے میں ایک سوراخ ہے۔ تم اس سوراخ سے مجھے اور اسلم کو دیکھ لینا۔ اگر تم آج کی رات نکال پائے تو کل سے جو تم کہو گے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہماری دوستی کو جس راستے پر بھی تم لے جانا چاہو میں جانے کے لیے تیار ہوں گی۔ راضی! مجھے گناہ اور ثواب کا پتہ نہیں ہے۔ اگر میں ایک پچاس سالہ بوڑھے کے ساتھ سو سکتی ہوں جو مجھے خرید کر لایا ہے اور جسے دنیا میرا شوہر کہتی ہے، تو پھر مجھے تمہارے ساتھ سونے میں بھی کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تم آج کی رات نکال پائے تو میں تمہارے ساتھ سونے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے میرے بالوں سے ہاتھ نکالا، کھڑی ہوئی اور گھر سے باہر چلی گئی۔

ٹیپ ریکارڈر پر آج بھی نصرت فتح علی خان کی وہی رشکِ قمر والی قوالی لگی ہوئی تھی جس کی ہلکی ہلکی آواز میرے دل کو چیر چیر کر اس کے اندر سے تمام گندگی نکال رہی تھی۔ ایمان کب کی جا چکی تھی۔ کیسٹ ختم ہو کر بند ہو گئی تھی لیکن میرے لاشعور میں اب بھی ایمان کی پہلی نظر گردش کر رہی تھی جو اس نے مجھ پر بیٹھک کی چھت پر کھڑے ہوئے ڈالی تھی۔

ایمان اس کے بعد دوبارہ رات کو کھانا بنانے کے لیے ہی ہمارے گھر آئی۔ عامر اسے دوپہر کو بلانے کے لیے بھی گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ ارم عامر کو ساتھ لے کر اس کے گھر چلی گئی۔ سارا دن ارم ایمان کے گھر ہی رہی اور پھر رات کو وہ دونوں ایمان کو ساتھ لے کر آئے۔

''راضی! اب طبیعت کیسی ہے؟ تمہارا بخار تو اتر گیا نا؟'' ایمان نے بڑی سادگی سے پوچھا تو میں نے سر ہلا

دیا۔

''ہاں بیٹا! اب ٹھیک ہے راضی، تمہاری برف کی پٹیوں سے میرے بیٹے کا بخار اتر گیا ہے۔'' امی نے پیار سے ایمان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''خالہ آپ کھانا دے دو اسلم کے لیے، وہ شہر سے واپس آ گیا ہے۔ کھانا کھا کر اسے جلدی سونا بھی ہو گا تا کہ وہ صبح جلدی اٹھ کر کام پر جا سکے۔'' ایمان نے امی سے کہا تو امی ٹفن میں اسلم کے لیے کھانا پیک کرنے لگی۔

''چلو راضی! مجھے اب گھر چھوڑ آؤ۔'' ایمان امی سے کھانے کا ٹفن لیتے ہوئے بولی۔

''جی جی! چلو! میں تم کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے چپل پہنتے ہوئے کہا۔

''ایمان ایک بار پھر دیکھ لو! میرا دل نہیں مانتا یہ سب کچھ کرنے کو۔'' ہم دونوں باہر گلی میں کھڑے تھے، مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ رات کو چوری چھپے ایمان کے گھر جانا، یہ بہت بڑا رسک تھا۔ اس لیے میں اندر سے ڈر رہا تھا۔

''نہیں راضی! اب وقت آ گیا ہے۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ شاید یہی صحیح وقت ہے یہ سب کچھ کرنے کے لیے۔'' اس نے اپنے بازو کھولے اور مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ رات کے اس وقت اس سنسان سی گلی میں ہم دونوں ایک دوسرے کو سینے سے لگائے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ ہم ایک دوسرے میں کھو گئے تھے۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک ہم یونہی ایک دوسرے لپٹے کھڑے رہے۔

''ٹھیک ہے ایمان! اب تم گھر جاؤ، گلی میں کوئی اچانک آ گیا تو مسئلہ بن جائے گا۔'' میں نے ایمان سے الگ ہوتے ہوئے کہا تو وہ بھی مجھ سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

''میں اور اسلم ابھی باہر صحن میں ہی کھانا کھائیں گے۔ کھانے کے بعد جب ہم سونے کے لیے کمرے میں چلے جائیں گے تو تھوڑی دیر بعد میں پانی پینے کے بہانے صحن میں آؤں گی اور دروازہ کھول دوں گی۔ تم صرف پانچ منٹ انتظار کرنا اور پھر اندر آ جانا۔ دروازے میں سوراخ ہے، تم خاموشی سے بس اسی سوراخ سے آنکھ لگا کر دیکھ لینا اور اس کے بعد خاموشی سے ہی واپس اپنے گھر چلے جانا، میں رات کو خود ہی دوبارہ کنڈی لگا لوں گی۔ تم یہ سب کچھ کر لو گے نا؟'' اُس نے میرے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''ہاں ایمان! میں کر لوں گا۔ تم فکر مت کرو۔'' میں اندر سے ڈر رہا تھا لیکن مجھے ایمان کو مطمئن کرنا تھا۔ مجھے

ایمان کے لیے یہ سب کچھ کرنا ہی تھا اور میں یہ سب کچھ کر بیٹھا تھا۔

''راضی! آج قیامت کی رات ہے، پلیز! میری خاطر اس قیامت سے گزر جانا۔'' اس نے ایک بار پھر میرے گالوں پر ہونٹ رکھے اور پھر دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ میں اپنے گالوں پہ ہاتھ رکھے باہر گلی میں ہی کھڑا ہو گیا۔

ایمان کو اندر گھر میں گئے تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ ٹائم ہو گیا تھا۔ وہ اسلم کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی اور میں باہر کھڑا ان کے اندر جانے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے اور پھر اندر چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایمان پانی پینے کے بہانے باہر نکلی۔ اس نے صحن میں رکھے گھڑے سے پانی نکال کر پیا اور پھر بیرونی دروازے کے پاس آ کر مجھے ہلکی سی آواز دی۔ میں نے آہستہ سے اسے جواب دیا تو وہ دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ دس منٹ تک میں نے ادھر گلی میں ہی خاموشی سے انتظار کیا اور پھر احتیاط سے دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ صحن کراس کر کے سامنے ہی ایک کچی اینٹوں کا بنا ہوا چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی بغل میں دو پلّر کھڑے کر کے اوپر لکڑی کی چھت بنا کر اوپر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ پنجابی میں ہم اسے ''ٹارا'' کہتے ہیں۔

اندر بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ جس کی روشنی لکڑی کے دروازے کی مختلف درزوں سے باہر آ رہی تھی۔ میں خاموشی سے صحن کراس کر کے دروازے پر پہنچا اور دروازے کی ایک درز سے آنکھ لگا کر اندر دیکھنے لگا۔

آج اس بات کو تقریباً ۱۶ سال ہو گئے ہیں۔ میری عمر اس وقت ۳۰ سال ہے۔ ۱۴ سال کی عمر میں جب میں نے اس دروازے کی درز سے آنکھ لگائی تھی تو اس وقت تک میں ایک کھلنڈرا سا ایک لڑکا تھا۔ لیکن اس رات نے مجھے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

ایمان صحیح کہتی تھی کہ قیامت اسی رات کو آ گئی تھی۔ آج واقعی کمرے کے اندر قیامت کا سماں تھا۔ مجھے یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہیے تھا، شاید مجھے وہاں ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لیکن خدا نے میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ میں وہاں اس دروازے کی درز سے آنکھ لگا کر اس قیامت کو دیکھ رہا تھا۔ ایمان ہر رات اس قیامت سے گزرتی تھی۔ لیکن میں اس قیامت کو برداشت نہیں کر سکا۔ یہ حقیقت ہے۔

میں آج بھی رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکتا۔ وہ منظر ہی کچھ ایسا تھا جسے دیکھنا میری برداشت سے باہر تھا۔

اسلم چار پائی پر بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا۔اس نے قمیض نہیں پہنی ہوئی تھی۔ نیچے اس نے گندی سی دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ایمان اس کی چار پائی کے کنارے پر بیٹھی اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

''اتنی دیر کیوں لگا دی تم نے کھانا لانے میں؟تمہیں پتہ ہے میں کتنی دیر تک تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں؟'' وہ غصے سے ایمان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ایمان خاموشی سے اس کے پاؤں دباتی رہی۔

''سنتی نہیں ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟ سارا دن آوارہ گھومتی رہتی ہو اور اب گونگی بن گئی ہو!'' اس نے ایمان کو لات ماری تو ایمان نیچے زمین پر گر گئی۔

''ہاں!جواب کیوں نہیں دیتی؟'' وہ غصے سے چلاّنے لگا تو میں ڈر کر دروازے سے تھوڑا دور ہو گیا۔

''ادھر آؤ!بیٹھو چار پائی پر!اب کھڑی کیوں ہو گئی ہو؟'' اس کی غصے سے بھری آواز باہر تک آ رہی تھی۔

ایک بار تو میرا دل چاہا کہ میں بھاگ جاؤں۔لیکن میں نے ہمت کی اور دوبارہ دروازے کی درز سے آنکھ لگا لی۔ایمان ابھی تک چار پائی سے تھوڑا ہٹ کر کھڑی تھی۔

''ادھر آؤ!'' اس نے چار پائی کے نیچے پڑی ہو چپل اٹھائی تو ایمان چار پائی پر آ کر بیٹھ گئی۔

''ٹانگیں دباؤ میری!'' اس نے زور سے چپل ایمان کے سر پر ماری تو وہ چیخ اٹھی اور رونے لگ گئی۔

''ٹانگیں دباؤ زور سے!ابھی ناٹک مت کرو رونے کا!میں سارا دن کام کر کر کے تھک جاتا ہوں اور تم سے ٹھیک طرح ٹانگیں بھی دبائی نہیں جا رہیں؟'' اس نے دوسری بار ایمان کے سر پر چپل ماری تو ایمان اپنی چیخ پر قابو پاتے ہوئے جلدی جلدی پاؤں دبانے لگی۔

''ہاں!اب ٹھیک ہے،اب ٹھیک دبا رہی ہو۔'' اس نے چپل زمین پر رکھی اور ایمان کے جسم پر دوبارہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

ایمان دس پندرہ منٹ تک ایسے ہی پاؤں دباتی رہی۔کبھی کبھار ایمان کا ہاتھ تھوڑا ہلکا ہوتا تو وہ زور سے ایک تھپڑ ایمان کی پیٹھ پر مارتا جس سے ایمان اس کے پاؤں اور زور سے دبانے لگتی۔

میری ہمت جواب دینے لگی تھی۔میں پہلی بار ایمان کو یوں مار کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔وہ ہر بار تھپڑ کھاتی،

چیختی اور پھر ٹانگیں دبانے لگتی۔

''چلواب بس کرو! ادھر لیٹو میرے پاس!'' اس نے ایمان کو بازو سے پکڑ کر کھینچا اور اپنے اوپر لٹا لیا۔

ایمان اس کے اوپر لیٹی ہوئی تھی اور وہ زور زور سے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ رہا تھا۔ تقریباً سو کلوگرام سے بھی اوپر کا وہ گوشت کا پہاڑ ۱۲ سال کی اس چھوٹی سی لڑکی کو انتہائی بے دردی سے نوچ رہا تھا۔

''چلواب کپڑے اتارو! اپنے سارے کپڑے اتار دو، چلو شاباش! جلدی کپڑے اتارو تمہارے شوہر کو اب ریلیکس ہونا ہے۔''

''نہیں، نہیں! مجھے کپڑے نہیں اتارنے، مجھے یہ کام نہیں کرنا۔'' ایمان زاروقطار رونے لگ گئی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی مگر اسلم نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بھاگ نہیں سکتی تھی۔

''دیکھو! میں تمہارا شوہر ہوں اور اچھی بیویاں وہی ہوتی ہیں جو اپنے شوہر کی ہر خواہش کو پورا کرتی ہیں، کبھی ان کو انکار نہیں کرتیں۔'' وہ اسے پیار سے منانے لگا۔ اس کے چہرے پر شیطانیت سوار تھی۔

''نہیں! مجھے جانے دو، مجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔'' وہ مسلسل رو رہی تھی اور اس کا پورا جسم خوف سے کپکپا رہا تھا۔

''چٹاخ۔۔۔۔۔!'' اسلم نے پوری قوت سے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا۔

ایمان زمین پر گرنے لگی لیکن چونکہ اسلم نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اس لیے اس نے اسے زمین پر گرنے نہیں دیا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اسے دوسرا تھپڑ مار دیا۔

اب کی بار ایمان زمین پر گر گئی۔ اس کا ہاتھ اسلم کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ایمان زمین پر گری کانپ رہی تھی اور رو رو کر شاید اس کا گلا خشک ہو گیا تھا اس لیے اس کی صرف ہچکیوں کی آواز آرہی تھی۔

''کپڑے کیوں نہیں اتارتی تم؟'' وہ غصے سے پھنکارا۔ اس نے زمین پر پڑی ہوئی ایمان کو گلے سے پکڑا اور اسے اپنے سامنے کھڑا کر دیا۔

''۳۰ ہزار میں خرید کر لایا ہوں میں تجھے تمہارے باپ سے! تمہارے باپ کو ۳۰ ہزار میں نے تمہاری شکل دیکھنے کے لیے نہیں دیئے۔ پتہ ہے نا کتنی بڑی رقم ہوتی ہے ۳۰ ہزار؟ تمہارے اور میرے جیسے لوگوں کی زندگی نکل

جاتی ہے ۳۰ ہزار اکٹھا کرنے میں۔ یہ تو گاؤں والوں کی مہربانی تھی جوانہوں نے اتنے پیسے اکٹھے کر کے دے دیئے مجھے۔'' وہ غصے سے ایمان کے سینے کو مسلنے لگا۔

''مجھے گھر جانا ہے! مجھے یہ سب کچھ نہیں کرنا، تم مجھے گھر بھیج دو۔'' ایمان ابھی بھی کپکپا رہی تھی۔

''گھر بھیج دوں! کچن میں پڑی چھری دیکھی ہے نا؟ اس چھری سے تمہارے باپ کا گلا کاٹ دوں گا اگر دوبارہ جانے کی بات کی!'' اسلم نے اسے ایک اور تھپڑ مار دیا۔

''چلو اب کپڑے اتارو! ہر رات ہی تماشہ لگا دیتی ہو۔'' اس نے ایک جھٹکے سے ایمان کی قمیض اتار دی۔

ایمان کی کمر دروازے کی طرف تھی۔ مجھے ایمان کی ننگی کمر نظر آنے لگی۔ سفید کمر پر زخموں کے لاتعداد نشانات مجھے نظر آرہے تھے۔ اسلم کی چھڑیوں اور تھپڑوں سے ایمان کی ساری کمر سرخ ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسلم کا صرف ایک ہی روپ دیکھا تھا اور آج میں اس کو بھیڑیا بنتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

اسلم ایمان کو لے کر چارپائی پر چلا گیا۔ ایمان رونے اور چلّانے لگ گئی تھی لیکن وہ جانور بنا ہوا تھا۔ رات کے ۱۱ بجے نمبرداروں کے اس گھر کے کمرے میں میاں بیوی کا کوئی پاکیزہ رشتہ نہیں بلکہ کوئی شیطانی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ ایمان درد سے چلّا رہی تھی لیکن اس کی چیخوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ درندہ اپنے شیطانی فعل میں مصروف تھا۔ اچانک ایمان نے ایک زوردار چیخ ماری اور اس نے دردناک نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

اسے معلوم تھا کہ میں دروازے کے اس پار یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ اس کی نظریں شاید مجھے ہی کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن اس نے مجھے خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھنے کا کہا تھا۔ اس کی نظروں میں جو بے بسی اور لاچارگی تھی، ان نظروں نے مجھے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا۔ ان سبز آنکھوں کی بے بسی نے مجھے سب کچھ بھلا دیا۔

میں نے کمرے کے دروازے کو زور سے لات ماری اور اونچی آواز میں اسلم کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح کسی کے گھر میں داخل ہونے کا ڈر اچانک ختم ہو گیا۔ میں ہر ڈر سے آزاد ہو گیا تھا۔ مجھے صرف ایمان کی چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''دروازہ کھول! وہ مر جائے گی بے غیرت انسان! دروازہ کھول اور ایمان کو چھوڑ دے ورنہ میں دروازہ توڑ

دوں گا!'' میں دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ لکڑی کا ایک بھاری دروازہ تھا جو باہر کی طرف کھلتا تھا۔ اس لیے میری لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔

''ایمان میں آ گیا ہوں! تم ڈرنا مت! میں ماردوں گا، میں سب کو ماردوں گا!'' میں پاگلوں کی طرح صحن میں دائیں بائیں چکر لگانے لگا۔

چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے صحن میں جو بھی چیز نظر آ رہی تھی وہ میں اٹھا کر دروازے پر مار رہا تھا۔ میری آواز باہر گلی تک جا رہی تھی۔ طارق بھائی مجھے دیکھنے کے لیے گلی میں ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے میرے چلّانے کی آوازیں سنی تو بھاگ کر اندر آئے لیکن میری حالت دیکھ کر وہ ڈر کر واپس گھر چلے گئے اور ابو کو جا کر میرا بتایا۔

اسلم اور ایمان اندر کمرے میں کپڑے پہن چکے تھے لیکن دروازہ کھولنے کی ہمت وہ نہیں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے تک یہی اسلم ایمان کو گلا کاٹنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی پر ظلم کرتے ہوئے شیر بنا ہوا تھا مگر باہر میرے پاگل پن نے اسے شیر سے بکری بنا دیا تھا۔

ذرا سی دیر میں میرے گھر والے آ گئے۔ ابو نے مجھے چیزیں اٹھا اٹھا کر دروازے پر مارتے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے دیکھا تو وہ جلدی سے بھاگ کر آئے اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔

''چھوڑ دو ابو! مجھے چھوڑ دو! وہ ایمان! وہ ایمان اندر کمرے میں مر جائے گی، وہ اسے مار رہا ہے۔ چھوڑ دو مجھے! ابو میں نے ایمان کو بچانا ہے۔'' میں ابو کے ہاتھوں سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ مجھے ابو کے ساتھ گتھم گتھا دیکھ کر طارق بھائی بھی آگے آ گئے اور ابو اور طارق بھائی دونوں نے مجھے پکڑ لیا۔

''ابو وہ ایمان کو مار رہا ہے! ایمان کو۔۔۔'' میری نظریں ابھی بھی دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور میں بار بار ابو اور بھائی کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔

''ثمینہ اسے پکڑو! میں اندر دیکھتا ہوں۔'' ابو نے امی کو کہا تو امی اور دوسرے بھائیوں نے مجھے پکڑ لیا۔

میں زور لگا لگا کر تھک چکا تھا لیکن پھر بھی ابھی تک میں ہلکی پھلکی مزاحمت کر رہا تھا۔ ابو نے مجھے چھوڑا اور جا کر اسلم کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔

''دروازہ کھولو اسلم! کیا ہوا ہے؟''

''میں ریاض ہوں، دروازہ کھولو!'' ابو نے اپنا نام بتا کر اس کو آواز دی تو اسلم ایمان کو لے کر باہر آ گیا۔

''یہ۔۔۔۔یہ ایمان کو مار رہا تھا۔ یہ کمینہ آدمی میری ایمان کو مار رہا تھا ابو!'' میں نے اسلم کو دیکھا تو میرا خون کھولنے لگا۔ میری ساری تھکاوٹ اتر گئی۔ میں ایک بار پھر زور لگانے لگا۔

''چھوڑ دو مجھے! میں سب کو مار دوں گا! میں سب کو مار دوں گا!''

''کیا ہوا ہے؟ یہ لڑکا اتنا پاگل کیوں ہو رہا ہے؟'' اسلم باہر آیا تو ابو اس سے سوال کرنے لگے۔

''پتہ نہیں چوہدری صاحب! ہم تو اندر لیٹے ہوئے تھے جب یہ سب کچھ اچانک ہونے لگا۔ دروازے کو اندر سے ہم نے کنڈی لگائی ہوئی تھی اس لیے یہ اندر نہیں آ سکا اور باہر ہی ہنگامہ کرنے لگا۔'' اسلم نے ابو کو دیکھا تو اسے کچھ حوصلہ ہو گیا تھا۔

''مجھے چھوڑ دو! میں کہہ رہا ہوں چھوڑ دو مجھے! یہ ایمان کو مار رہا تھا۔۔۔ میں مار دوں گا آج اس کو! ابو یہ بھیڑیا ہے بھیڑیا۔'' میں حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگا۔

پورا گھر مجھے سنبھالنے میں لگا ہوا تھا۔ ابو ابھی تک اس سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ میں زور لگانے لگا کر ہانپنے لگ گیا تھا۔ امی اور تینوں بھائیوں نے مجھے پکڑا ہوا تھا۔

''چوہدری! اپنے بیٹے کو سنبھالو، یہ پاگل ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں اسے اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے اور یہ ہمارے گھر میں کیا کر رہا ہے۔'' وہ ابو کو مجھے سنبھالنے کا کہہ رہا تھا۔ ابو کی سمجھ میں کوئی معاملہ نہیں آ رہا تھا۔

''میں تو ایمان کو گھر چھوڑنے آیا تھا۔ پھر یہ اچانک اتنا سب کچھ پتہ نہیں کیسے ہو گیا۔ اسلم آخر کوئی تو معاملہ ہو گا! میرا بیٹا بہت حساس ہے، کہیں تم ایمان کو مار تو نہیں رہے تھے؟''

''کیوں ایمان بیٹا! یہ تمہیں مار تو نہیں رہا تھا؟'' ابو نے ایمان کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

اسے میری وحشت سے کوئی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ شاید اس گھر میں اس وقت صرف ایمان ہی تھی جسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ہاں! یہاں ایمان ہی تھی جس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ شاید شہزادہ سات سمندر پار کر کے شہزادی کو دیو سے

بچانے کے لیے آ گیا تھا۔

’’نہیں چاچو! کچھ نہیں ہوا ہے۔ہم اندر باتیں کر رہے تھے، راضی کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔‘‘ اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور ابو کو بتانے لگی۔

’’ٹھیک ہے بیٹا! لیکن اگر کوئی بھی مسئلہ ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ میں نے تجھے اپنی بیٹی کہا ہے اور بیٹی جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں تیرے لیے کروں گا۔‘‘ انہوں نے ایمان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

چولستان کے اس چھوٹے سے صحرائی گاؤں کے گورکھ دھندوں سے وہ ساری زندگی لڑتے لڑتے تھک جاتے لیکن پھر بھی اسے ٹھیک نہیں کر سکتے تھے۔ یہ مردوں کا معاشرہ تھا۔ یہاں عورتیں بکتی تھیں اور بکی عورت کو موت ہی آزاد کروا سکتی تھی۔

’’ایمان! تم جھوٹ کیوں بول رہی ہو؟ یہ تمہیں چھری سے ذبح کرنے لگا تھا۔ تم ڈرو مت! اسے میں ذبح کروں گا۔ میں ان لوگوں کے ہاتھوں سے نکلنے کے لیے دائیں بائیں ہاتھ مار رہا تھا۔ اچانک میرے ہاتھوں میں عامر کا گلا آ گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں عامر کا گلا پکڑا اور اسے دبانے لگا۔

’’چھوڑ دو مجھے! چھوڑ دو!‘‘ میں اونچی اونچی آواز میں چلّانے کے ساتھ ساتھ عامر کا گلا بھی دبا رہا تھا۔

جب عامر کا سانس بند ہوا تو اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں آنے لگیں۔ وہ میرے ہاتھوں میں جھولتے ہوئے نیچے گرا تو ہم سب ہی نیچے زمین پر گئے۔

’’اسے چھوڑ جانور! وہ مر جائے گا۔‘‘

’’ریاض! عامر کو بچاؤ! یہ جانور اسے مار دے گا!‘‘ امی نے جب عامر کو یوں ہاتھ پاؤں چھوڑتے ہوئے دیکھا تو وہ میرے چہرے پر زور زور سے تھپڑ مارنے لگیں۔

’’ریاض! میرے بیٹے کو بچاؤ!‘‘ امی ابو کو آوازیں دینے لگی اور پوری قوت سے میرے منہ پر تھپڑ مار رہی تھیں لیکن مجھ پر جنون سوار تھا اور میں اسی جنون میں عامر کا گلہ دبا رہا تھا۔

ابو تیزی سے میرے پاس پہنچے اور انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں کے درمیان بازو دے کر جھٹکا دیا تو عامر کا

گلا میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ انہوں نے مجھے زمین سے اٹھایا اور دونوں بازوؤں میں جکڑ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں ان کے سینے سے لگا مزاحمت کرتا رہا لیکن انہوں نے مجھے بڑی بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ میں ان کے بازوؤں سے نہ نکل سکا اور سسک سسک کر رونے لگا۔

''ابو! ایمان مر تو نہیں جائے گی نا؟ وہ اسے مار تو نہیں دے گا نا؟'' میں اب ہوش میں آنے لگ گیا تھا۔

میں نے مزاحمت کرنا چھوڑ دی اور ابو کے گلے لگ کر رونے لگ گیا۔ ابو مجھے سینے سے لگائے پیار سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ مجھے تھوڑا سکون ملا تو میں ابو کے گلے سے علیحدہ ہو گیا۔

''نہیں بیٹا! ایمان کے ساتھ ہم سب ہیں، ایمان کو ہم کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ تم فکر مت کرو ایمان ہمارے گھر کی ایک فرد ہے۔'' ابو نے مجھے حوصلہ دیا تو میں ایمان کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی سبز آنکھوں کی روشنی بہت بڑھ گئی تھی۔

''اسلم!'' ابو میری طرف سے مطمئن ہوئے تو اسلم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''مجھے نہیں معلوم یہاں کیا ہوا ہے اور مجھے کچھ جاننا بھی نہیں ہے، لیکن میری ایک بات یاد رکھنا اسلم! عورت کی اگر عزت کرو گے تو ساری زندگی عزت کی زندگی جیو گے۔ بے شک تم اسے خرید کر لائے ہو، یہ تمہاری بیوی ہے۔ لیکن یہ ابھی چھوٹی بچی ہے، تم نے ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنی ہے۔ اس کی زندگی میں آسانیاں پیدا کیا کرو۔ اسلم! تم خود بھی خوش رہو گے ورنہ اگر یہ مشکل میں آئی تو یقین کرو تم ابھی مجھے اتنا نہیں جانتے میں تمہاری زندگی عذاب بنا دوں گا۔ میں نے اسے بیٹی کہا ہے۔ میں تمہارا اور تمہارے گھر کا سارا خرچہ اس ایمان کی وجہ سے اٹھا رہا ہوں اور اگر مجھے پتہ چلا کہ تم ایمان کو مارتے ہو تو میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ خدا نے مجھے چار چار بیٹے دیئے ہیں۔ میرا پورا خاندان اس گاؤں میں رہتا ہے اور تم اکیلے ہو۔ کس کس سے لڑو گے اسلم؟ تھک جاؤ گے لڑتے لڑتے، اس لیے ظلم مت کرو۔ شیر وہی ہوتا ہے جو گھر سے باہر شیر ہو، گھر کے اندر تو بکریاں بھی شیر ہوتی ہیں۔ اس لیے گھر کے شیر مت بنو، اپنی اور ایمان دونوں کی زندگیاں آسان بناؤ تو زندگی اچھی گزرے گی۔'' ابو اسلم کے کندھے پر ہاتھ رکھے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہے تھے۔ ابو کی باتیں سن کر مجھے اور ایمان دونوں کو حوصلہ مل رہا تھا۔

''چلو ایمان بیٹی! آج رات تم ہمارے گھر میں ہی سوؤ گی، کل کو میں نمبر داروں سے بات کر کے ہی تمہیں

یہاں بھیجوں گا۔'' ابو نے ایمان کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر ہم سب اپنے گھر آ گئے۔

''ایمان بیٹی کیا ہوا تھا؟ اسلم نے مارا تھا تمہیں؟'' ابو ایمان سے ایک بار پھر پوچھنے لگے۔

ہم سب گھر آ کر کمرے میں بچھی چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ابو ایک پھر ایمان کو کریدنے لگے لیکن ایمان نے ہنس کر بات کو ٹال دیا۔

''نہیں چاچو! کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس سیالکوٹیے کو شاید دورہ پڑ گیا تھا۔''

ہمارے گھر آ کر ایمان کی شوخی لوٹ آئی تھی اور وہ مجھ سے مذاق کرنے لگی۔ میں چار پائی پر خاموشی سے نظریں جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ میری ساری وحشت ختم ہو گئی تھی۔

''جی باجی ایمان! اسے دورہ ہی پڑا ہو گا۔ آج اگر ابو مجھے نہ بچاتے تو اب تک میں جنت میں حوروں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا ہوتا۔'' عامر نے ایمان کی بانہوں میں جھولتے ہوئے کہا تو سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

''پہلے اس حور سے تو جان چھڑا لو! پھر جنت کی حوروں سے بھی مل لینا۔'' ایمان نے عامر کو چار پائی پر گرا یا اور اس کے چہرے پر بوسوں کی برسات کر دی۔

ایمان اسے گدگدی بھی کر رہی تھی اور اس کے چہرے پر بوسوں کے ساتھ ساتھ اپنی ٹھوڑی بھی رگڑ رہی تھی۔ گدگدی سے ہنس ہنس کر جب عامر کا برا حال ہو گیا تو ایمان نے اسے چھوڑ دیا۔ عامر ایمان کے ہاتھ سے نکلا تو بھاگ کر دوسری چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے گال ایمان کے ہونٹوں کی سرخی کی وجہ سے سرخ ہو گئے تھے۔

''کیوں جی! ہم کسی جنت کی حور سے کم ہیں؟'' ایمان نے عامر کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''جی حور نہیں، آپ تو چڑیل ہو جو چھوٹے بچوں کا خون چوستی رہتی ہو۔'' عامر نے ایمان کو دیکھ کر ناک چڑھائی اور بھاگ کر میرے پیچھے گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھنا چاہا تو وہ ایک بار وہاں سے نکلا اور امی کے پاس چلا گیا۔

''سوری سیالکوٹیے بھائی! میرا ابھی جنت میں جانے کا موڈ بالکل بھی نہیں ہے۔''

ہم اسی طرح مزید ایک دوسرے کو مذاق کرتے رہے۔ اس کے بعد ایمان اور ارم دونوں ایک ہی چار پائی پر

سوگئیں اور ہم لوگ بھی اپنی اپنی چار پائیوں پر سو گئے۔

اگلی صبح ابو نے ایمان کو ساتھ لیا اور نمبرداروں کے گھر چلے گئے۔ اسلم پہلے ہی وہاں چار پائی کے ساتھ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ نمبردار چار پائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

ہمارے ہاں پاکستان کے اکثر دیہات میں ملازم کبھی بھی مالک کے ساتھ ایک چار پائی پر نہیں بیٹھتے بلکہ وہ مالک کے سامنے زمین پر ہی بیٹھتے ہیں۔ مالک نوکر کو اپنے ساتھ چار پائی پر بٹھانا توہین سمجھتا ہے۔ آپ لوگوں کو شاید حیرانگی ہو لیکن پاکستان میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ جرمن نہیں ہے۔ جرمن اور پاکستان میں بہت فرق ہے۔ آج بھی نمبردار اور چوہدری اپنے نوکروں کو غلام ہی سمجھتے ہیں۔ اسلم بھی نمبرداروں کا نوکر تھا۔ وہ نمبردار کے سامنے زمین پر بیٹھا ہوا زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں بنا رہا تھا۔

''آؤ ریاض آؤ!'' نمبردار نے میرے ابو کو دیکھا تو چار پائی سے اٹھ کر سلام کیا اور اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

بے شک ہم نمبرداروں کے مقابلے میں بہت زیادہ غریب تھے۔ ہمارے پاس زمین کے نام پر صرف ۱۴ ایکڑ ہی تھے لیکن پھر بھی میرے والد نوکر نہیں تھے۔ وہ اپنی زمین پر خود کاشت کرتے تھے۔ نمبرداروں کے پاس ۱۲۰۰ ایکڑ سے بھی زیادہ زمین تھی اور ان کے پاس دس بارہ ملازم بھی تھے۔ چونکہ وہ میرے والد کے بچپن کے دوست تھے اس لیے میرے والد بلاتکلف ان کے گھر آتے جاتے تھے۔

''ریاض بھائی! رات کو کیا مسئلہ ہو گیا تھا جو یہ صبح سے معافیاں مانگ رہا ہے۔'' نمبردار نے غصے سے اسلم کی طرف دیکھا۔

ایمان اسلم کے ساتھ نیچے زمین پر بیٹھنے لگی تو ابو نے اسے اپنے ساتھ ہی چار پائی پر بٹھا لیا۔

''ہاں ریاض بھائی! اب بتاؤ رات کو کیا ہوا تھا؟'' نمبردار نے ابو سے ایک بار پھر پوچھا تو ابو اسے رات والا واقعہ بتانے لگے۔

''ایمان! کیا اسلم نے رات کو تجھے مارا ہے؟'' نمبردار نے ابو کی پوری بات سن کر ایمان سے پوچھا تو ایمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جی چاچا جی! رات کو اسلم مجھے مار رہا تھا۔ میری چیخوں کی آواز سن کر ہی راضی گھر کے اندر آ گیا تھا اور دروازے سے کان لگا کر شاید اس نے ساری باتیں سن لی ہوں گی۔'' ایمان ساری رات انکار کرتی رہی تھی لیکن ابھی نمبر دار کے سامنے اس نے اسلم کے مارنے کی تصدیق کر دی تھی۔

''بیٹا! رات کو جب میں نے پوچھا تھا تو تب تم نے کیوں جھوٹ بولا تھا؟'' ابو ایمان کی باتیں سن کر حیران رہ گئے۔

''چاچا! رات کو میں سارے گھر والوں کے سامنے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ گھر والوں کے سامنے مجھے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔'' ایمان نے پوری تفصیل بتائی تو تب ابو کو ساری بات کا پتہ چلا۔

وہ ساری رات اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کو اس سارے واقعے کی تفصیل کا اب پتہ چلا تھا۔

''بیٹا! کبھی بھی شرمندگی کے ڈر سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔'' انہوں نے ایمان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اسلم! ابھی ریاض ایمان کو لے کر تمہاری شکایت لے کر آیا ہے۔ ایمان تمہاری بیوی ہے۔ ٹھیک ہے یہ تمہارا گھر کا اندرونی معاملہ ہے لیکن ایمان ابھی بچی ہے۔ اس پر ہاتھ مت اٹھاؤ۔ اگر آج کے بعد تم نے ایمان پر ہاتھ اٹھایا تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ اب ایمان سے معافی مانگو! وہ بچی ہے، اس سے نرمی سے پیش آیا کرو۔'' نمبر دار نے معاملے کو ختم کرتے ہوئے کہا تو اسلم ایمان سے معافی مانگنے لگ گیا۔

''ایمان! اب تم بھی اسے معاف کر دو، آئندہ یہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔'' نمبر دار نے اسلم کو معافی مانگتے ہوئے دیکھا تو وہ ایمان سے کہنے لگا۔ ایمان نے اثبات میں سر ہلا کر رضامندی ظاہر کی تو معاملہ ختم ہو گیا۔

''چلو اسلم! تم اب کھیتوں پر چلے جاؤ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ ریاض نے بھی کام پر جانا ہے۔ ایمان تو ریاض کے گھر ہی جائے گی نا؟ رات کو کام سے واپسی پر تم اسے لے جانا اور دوبارہ شکایت کا موقع نہ دینا۔'' نمبر دار چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا تو باقی بھی سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''دیکھو نمبر دار صاحب! ابھی تو میں اس معاملے کو ختم کر رہا ہوں۔ تم میرے دوست ہو اس لیے میں سب سے

پہلے تمہارے پاس ہی آیا ہوں لیکن اگر کل کو اس نے پھر ایمان کو کوئی تکلیف دی تو میں اس معاملے کو پنچائیت میں اٹھاؤں گا۔

پاکستان کے دور دراز کے چھوٹے چھوٹے دیہات جہاں پولیس کی عملی مداخلت بہت کم ہوتی ہے وہاں گاؤں کے دس بارہ بڑے بڑے چوہدری لوگوں کی جماعت ہوتی ہے جسے پنچائیت کہتے ہیں۔

آپ اسے گاؤں کی پارلیمنٹ کہہ سکتے ہیں۔ گاؤں کے تمام چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے اور فیصلے یہی پنچائیت متفقہ طور پر کرتی ہے۔ لیکن جب معاملہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے تو پھر پولیس مداخلت کرتی ہے اور معاملہ پولیس سے پھر عدالت تک پہنچ جاتا ہے۔ ابو بھی اسی پنچائیت کی بات کر رہے تھے۔

''نہیں ریاض! ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ اب ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ اور اگر اس نے کچھ ایسا ویسا کیا تو تمہیں پنچائیت میں جانے کی ضرورت نہیں، میں خود ہی اس کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔'' نمبردار نے زور سے ایک تھپڑ اسلم کے کندھے پر مارا تو اس نے فوراً ہاتھ جوڑ لیے۔

''نہیں چوہدری صاحب! مجھے معاف کر دو! میں آج کے بعد کبھی بھی ایمان پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔

اسلم نوکر تھا اسے اپنی اوقات کا پتہ تھا۔ اس لیے اس نے ہاتھ جوڑنے میں عافیت جانی۔

''ٹھیک ہے یار! مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔'' ابو نے نمبردار سے ہاتھ ملایا اور ایمان کو لے کر گھر آ گئے۔

ارم اور عامر بھائی سکول چلے گئے تھے۔ میرے دونوں بڑے بھائیوں نے سکول کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ کالج ہمارے گاؤں سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور یزمان میں تھا اور یزمان آنے جانے میں روزانہ بس کا بہت کرایہ تھا۔ ابو کالج کا خرچہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ طارق بھائی تو ابو کے ساتھ ہی ڈیرے پر چلے جاتے تھے۔ اس سے چھوٹے بھائی اڈے پر الیکٹریشن کی ایک دکان پر کام سیکھنے لگ گئے۔ دکان کا مالک اسے مہینے کے چار پانچ سو روپے دے دیتا تھا۔

ہم سب لوگ کھانا کھا چکے تھے جب ابو ایمان کو لے کر گھر پہنچے۔

''راضی! تم سکول نہیں گئے؟'' ابو نے ابھی تک مجھے گھر میں ہی بیٹھا دیکھا تو پوچھنے لگے۔

''نہیں ابو! میرا آج سکول جانے کو دل نہیں کر رہا، میرا سر ہلکا ہلکا درد کر رہا ہے۔'' میں نے بہانہ بنایا۔ میرا آج واقعی سکول جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے! تم ایمان کے ساتھ گھر میں ہی رہو۔ ثمینہ! تم تو چل رہی ہو نا میرے ساتھ ڈیرے پر؟'' ابو امی سے ڈیرے پر جانے کا پوچھنے لگے تو امی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ابو اور بھائی کے ساتھ ڈیرے پر چلی گئی۔

گھر میں میں اور ایمان دونوں ہی رہ گئے۔ مجھے ایمان پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے رات کو جھوٹ بولا تھا۔ ساری رات میرے گھر والے مجھے برا بھلا کہتے رہے تھے۔ میں ساری رات ان کی باتیں سنتا رہا تھا لیکن ایمان نے ایک بار بھی ان کو روکا نہیں تھا۔ وہ سب کچھ جانتی تھی لیکن پھر بھی خاموش رہی۔ میں چولہے کے پاس سے اٹھا اور اندر کمرے میں جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''راضی! ناراض ہو مجھ سے؟'' ایمان میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔

''نہیں، میں کیوں ناراض ہوں گا! میں تو بہت خوش ہوں۔ پوری رات میری عزت افزائی جو ہوئی ہے۔ اور تم نے ایک بار بھی ان کو روکا تک نہیں! کیوں؟'' میں نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ وہ میری چارپائی پر بیٹھی میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یار! سوری بول تو رہی ہوں، ابھی کیا جان لو گے؟'' وہ مجھے منانے لگی۔

''جان تو وہ لیتا تمہاری! اچھا تھا اگر وہ تجھے ایسے ہی مارتا رہتا؟ تم بھی خوش تھی!'' میں نے چارپائی پر کروٹ بدلی اور دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ لیکن وہ کچھ زیادہ ہی بے باک ہو رہی تھی، اس نے میرے اوپر سے چھلانگ لگائی اور دوسری طرف آ گئی۔

''کیوں جی! ایسے جان چھڑا لو گے مجھ سے؟'' اس نے مجھے سیدھا کیا اور میرے پیٹ پر بیٹھ گئی۔

''اتنی جلدی جان چھوڑنے والی چیز نہیں ہوں میں!'' اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا، ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں وہ میرے اوپر لیٹ گئی۔

اس نے دونوں ہاتھ میرے سر کے پیچھے ڈال کر میرا سر تھوڑا اوپر اٹھایا اور میری گالوں اور ماتھے کو اپنے ہونٹوں کی سرخی سے لال کرنے لگی۔ اگلے کئی منٹ تک وہ میرے چہرے اور گردن کے ہر حصے کو چومتی رہی۔ اس

کے ہونٹوں کی ساری سرخی اتر کر میرے چہرے پر لگ چکی تھی۔

مجھے تھوڑی ہوش آئی تو میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر نیچے گرایا اور خود اس کے اوپر لیٹ گیا۔ اب کی بار میں اسے چومنے لگا۔ اس کی آنکھیں ہونٹ گال اور گردن، میں اسے ہر جگہ سے چوم رہا تھا۔ میرے ہاتھ اس کے سینے پر آزادانہ گھوم رہے تھے۔ میں اس کے چہرے اور گردن سے نیچے آ گیا۔

وہ میرے سامنے چارپائی پر بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے پیٹ سے قمیض اٹھائی تو اس کا گورا بے داغ پیٹ میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر دبایا اور اس کے ننگے پیٹ پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکلی تو میں نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی شاید بہت کوشش کی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کی بند آنکھوں سے باہر نکل کر اس کے گالوں کو بھگو گئے تھے۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

''ایمان!'' میں نے اسے آہستگی سے آواز دی لیکن وہ خاموش لیٹی رہی۔

''ایمان!'' میں نے اسے دوسری بار آواز دی تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا راضی! رک کیوں گئے ہو؟ یہی تو تم چاہتے تھے نا! آج میں ساری کی ساری تمہارے سامنے ہوں۔ ساری کی ساری ایمان آج تمہاری دسترس میں ہے تو پھر یہ رکنا کیسا راضی؟'' میں خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ جنت کی حور سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی سبز آنکھوں میں آج پوری دنیا کے ستارے جگمگا رہے تھے۔

''ایمان! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟'' میں نے اس کے ننگے پیٹ کو قمیض سے ڈھانپا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

''نہیں راضی! میری ابھی محبت کی عمر نہیں ہوئی ہے۔'' وہ بڑے پرسکون انداز میں میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''محبت کی عمر نہیں ہوتی ایمان! یہ تو کسی کو کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔شاید تم کو بھی کبھی کسی سے محبت ہوئی ہو گی؟'' میں اس کے گالوں کو سہلانے لگا۔

''راضی! محبت تو قسمت والوں کی ہوتی ہے مگر میں تو بہت بدقسمت ہوں۔ میری قسمت میں محبت کہاں، یہ تو خدا کسی کسی کے نصیب میں لکھتا ہے۔نہیں راضی! مجھے کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔'' وہ ہاتھ سے میرے گالوں پر لگی سرخی مٹانے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے چہرے ہٹا دیا۔

''ایمان! میں نے محبت کی ہے، شاید مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔'' میں چار پائی سے نیچے اترا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر صحن میں نیم کے درخت کے نیچے چار پائی پڑی ہوئی تھی میں جا کر اس پر بیٹھ گیا۔دل میں ایک عجیب سا درد ہو رہا تھا۔ مجھے کسی بھی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ میں چار پائی پر بمشکل دو منٹ تک ایسے ہی بیٹھا رہا مگر سکون نہیں ملا۔ سینے کے اندر جلن محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اندر سے کاٹ رہا ہو۔ میں چار پائی سے اٹھا اور اوپر چھت پر چلا گیا۔سورج کافی اوپر آ گیا تھا اور دھوپ کی شدت بڑھ چکی تھی۔ میں ایسے ہی چھت پر دائیں بائیں گھومنے لگا۔میرا کہیں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔

''راضی! نیچے آ جاؤ اوپر دھوپ بہت تیز ہے۔اگر گرمی لگ گئی تو بیمار پڑ جاؤ گے۔'' ایمان نے نیچے سے مجھے آواز دی۔

میں نے نیچے صحن میں کھڑی ایمان کو دیکھا۔ وہ بھی دھوپ میں کھڑی مجھے آوازیں دے رہی تھی۔شاید یہ دھوپ کی گرمی تھی یا میرے اندر کی آگ، پل بھر میں ہی میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میں خاموشی سے نیچے اتر کر چولہے کے پاس بیٹھ گیا۔

''راضی! ایسے نہ کرو یار اگر بیمار ہو گئے تو؟'' وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''ایمان! تمہیں اپنے گھر والے یاد نہیں آتے کیا؟'' وہ چولہے میں لکڑیاں ڈال کر آگ جلا رہی تھی۔

''ایمان! تمہارے ماں باپ، بہن، بھائی۔۔۔۔کوئی تو ہو گا نا ادھر گجرات میں۔۔۔۔۔کیا تمہیں کبھی ان کی یاد نہیں آئی؟'' میں بھی اس کے ساتھ آگ جلانے لگا۔۔۔۔وہ ہم دونوں کے لیے چائے بنانے لگی۔

''نہیں راضی! میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ ماں مرگئی ہے، صرف باپ ہے۔ گجرات میں میرا کوئی نہیں ہے۔ باپ کے لیے ایک فضول چیز تھی جس کا اس نے تیس ہزار روپیہ وصول کیا ہے۔ گجرات میں مجھے کسی کی یاد نہیں آتی۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ وہ سر جھکائے آگ جلاتی رہی۔ میرے سینے میں ایک بار پھر درد ہونے لگا۔ میں نے گھبراہٹ میں ایمان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے آگ جلانی بند کردی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''راضی! کیا بہت درد ہو رہا ہے؟'' اس نے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''محبت کر بیٹھے ہو کسی سے؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''ہاں ایمان! محبت ہو گئی ہے۔ شاید محبت کا درد ہی ہے جو میرے سینے کو جلا رہا ہے۔'' میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''راضی!'' اس نے مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''راضی! مجھے محبت نہیں ہوئی ہے، مجھے کسی سے محبت نہیں ہے۔''

چائے تیار ہو چکی تھی۔ اس نے چائے اتار کر دو پیالیوں میں ڈالی اور ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔ میں بار بار ایمان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ نظریں جھکائے چائے پینے میں مصروف رہی۔

''چلو ایمان! ڈیرے پر چلتے ہیں، یہاں گھر میں کیا کرنا ہے۔'' میرا اب گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

''بس تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ! میں روٹی بنا لیتی ہوں تو ڈیرے پر روٹی لے جاتے ہیں۔ چاچو اور چچی دونوں خوش ہو جائیں گے۔'' ایمان نے مجھے کہا اور جلدی جلدی روٹی بنانے لگی۔

جب ایمان روٹی بنا چکی تو میں نے تھوڑا سا اچار لے کر اسے روٹی کے ساتھ باندھا اور ایمان کو ساتھ لے کر ڈیرے کی طرف چل پڑا۔

ہمارا ڈیرا گاؤں سے تقریباً ۴۰ یا ۴۵ منٹ کی مسافت پہ تھا۔ جب ہم ڈیرے پر پہنچے تو امی اور طارق بھائی تو جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اور ابو توری کے کھیت کی گوڈی (پودوں کے دائیں بائیں کی مٹی کو نرم کرنا، اس سے پودہ تیزی سے بڑھتا ہے اور پھل بھی زیادہ دیتا ہے) کر رہے تھے۔

''ابو! میں کھانا لے کر آیا ہوں۔ آپ کھانا کھاؤ، گوڈی میں کر دیتا ہوں۔'' میں نے ابو کے ہاتھ سے کسّی لے لی اور گوڈی کرنے لگا۔

''چھوڑو بیٹا! ابھی گرمی بہت بڑھ گئی ہے۔ ہم روزانہ تین چار گھنٹے ہی گوڈی کرتے ہیں، ہفتے تک کھیت مکمل تیار ہو جائے گا۔ تم رہنے دو! آج کھانا کھا کر گھر چلتے ہیں۔ باقی کام کل کر لیں گے۔'' ابو نے مجھے منع کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں ابو! آپ لوگ کھانا کھاؤ، میں آپ کا تھوڑا ہاتھ بٹا دیتا ہوں۔'' مجھے کام کرتا ہوا دیکھ کر ابو چلے گئے۔

انہوں نے ڈیرے پر لگے نلکے سے ہاتھ دھوئے اور شیشم کے درختوں کے سائے تلے بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ میں نے گوڈی کرنا شروع کی تو پھر مجھے کسی گرمی کی دھوپ کا کوئی احساس نہ رہا۔ وہ ایک ایکڑ سے بڑا کھیت تھا۔

سینکڑوں کی تعداد میں لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے۔۔۔ میں ایک سرے سے شروع ہوا اور گوڈی کرنے لگا۔ گھر والوں نے کھانا ختم کیا تو وہ مجھے آوازیں دینے لگے لیکن میں اپنے کام میں ہی مصروف رہا۔

''چلو بیٹا! اب چھوڑ دو۔۔۔۔۔ گھر چلتے ہیں۔ باقی کل ہو جائے گا۔'' ابو مجھے گھر لے جانے کے لیے آ گئے۔

''نہیں ابو! آپ لوگ چلے جائیں میں مزید گھنٹے تک اور کام کروں گا اس کے بعد خود ہی گھر آ جاؤں گا۔ آپ لوگ جائیں، ارم اور عامر بھی گھر آ گئے ہوں گے۔'' ابو بھائیوں سے کھیتوں کا تھوڑا بہت کام کرواتے رہتے تھے۔

''ٹھیک ہے بیٹا! آدھے گھنٹے تک مزید کام کر کے آ جانا۔۔۔۔۔۔۔ ہم پھر گھر چلتے ہیں۔''

''چلو ثمینہ! ایمان بیٹی چلو گھر چلتے ہیں۔'' ابو نے امی اور ایمان سے کہا تو امی تو اٹھ کر ابو کے ساتھ چل دی لیکن ایمان وہیں کھڑی رہی۔

''چاچو! آپ لوگ چلے جائیں۔۔۔ میں راضی کے ساتھ آئی تھی اور اسی کے ساتھ ہی گھر آ جاؤں گی۔'' ایمان نے ساتھ جانے سے انکار کیا تو ابو، امی اور طارق بھائی گھر کی طرف چل دیئے۔

میں گرمی اور پسینے سے بے نیاز کھیت کی گڈائی کرتا رہا۔ ایمان کھیت کے کنارے پر آ کر دھوپ میں ہی بیٹھ گئی۔

''ایمان! تم دھوپ میں کیوں بیٹھ گئی ہو۔۔۔۔۔۔ادھر ڈیرے پر چلی جاؤ، وہاں درختوں کا سایہ ہے۔'' میں نے ایمان کو دھوپ میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہا۔

''کوئی بات نہیں۔۔۔۔ مجھے ادھر کافی سکون ہے۔تم کام کرو۔۔۔۔لگتا ہے سیالکوٹیے کو آج سچ میں محبت ہو گئی ہے۔ چلو پھر شاباش! آج محبت کے لیے پورا کھیت حاضر ہے۔ہم بھی دیکھتے ہیں آپ کتنے بڑے عاشق ہو۔'' ایمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ ابھی بھی مجھ پر پورا یقین نہیں کر رہی تھی۔

لوہے کو جب بھٹی میں سے گزارا جائے تو وہ کندن بن جاتا ہے۔ کندن تو میں کل رات ہی بن گیا تھا اور میں بھٹی کی آگ سے نہیں بلکہ اس کمرے کے جہنم کی آگ سے نکل کر کندن بنا تھا۔ مجھ پر اب یہ چھوٹی موٹی بھٹی کی آگ اثر نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے کسی اٹھائی اور گوڈی کرنے لگا۔

منٹ دو منٹ ایک ایک کر کے گزرتے رہے اور میں ایک پودے سے دوسرے پودے تک جاتا رہا۔ میں پورے کھیت سے گزر چکا تھا۔ بس آخری پانچ چھ پودے رہ گئے تھے۔ سات آٹھ دن کا کام میں نے ایک دن میں ختم کر دیا تھا۔

سورج غروب ہونے کے نزدیک آیا تو ابو جانوروں کا دودھ دوہنے کے لیے کھیتوں میں آئے۔ انہوں نے مجھے ابھی تک گوڈی کرتے دیکھا تو بھاگ کر میرے پاس آ گئے۔

''یار! تم نے پورا کھیت کھود ڈالا ہے! رات والا جنون ابھی تک اترا نہیں ہے؟'' انہوں نے میرے ہاتھ سے کسّی لینی چاہی تو میں نے اسے دوسرے ہاتھ میں کر لیا۔

''بس ابو یہ پانچ چھ پودے رہ گئے ہیں۔۔۔۔۔آپ دودھ نکالو میں اب ختم کر کے ہی آتا ہوں۔''

''ایمان بیٹی! تم ہی اسے منع کر دیتی۔۔۔۔تم ساتھ کھڑی ہو کر اسے مسلسل کام کرتا ہوا دیکھتی رہی؟'' ابو ایمان سے شکوہ کرنے لگے۔

''چاچو! یہ میری کون سی بات مانتا ہے۔ ویسے بھی سیالکوٹ والے کافی جان والے ہوتے ہیں۔ دیکھ لو! آپ کا پورے ہفتے کا کام اس نے کر دیا ہے۔ اب آپ کوئی دوسرا کام کر سکتے ہو۔ ایمان نے شوخی سے کہا اور ابو کے بازو میں بازو ڈالے انہیں ڈیرے پر لے گئی۔ دس پندرہ منٹ تک میں نے بھی کھیت مکمل کر لیا اور ڈیرے پر آ گیا۔

ایمان اور ابو دودھ نکالتے رہے۔ میں ان کو ایسے ہی چھوڑ کر اکیلا گھر آ گیا۔ گھنٹے تک ابو اور ایمان بھی دودھ نکال کر آ گئے۔ رات کا کھانا ہم سب نے مل کر کھایا۔ اس کے بعد ابو خود ایمان کو لے کر اسلم کے گھر چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

اسلم گھر میں ہی موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ڈر گیا۔ میرا غصہ ایک بار پھر عروج تک پہنچ گیا تھا۔ اسلم کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ ایمان کو شاید ان سب چیزوں کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ ابو کے ساتھ چلتی چلتی دو قدم پیچھے ہوئی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں اسلم کو دیکھ کر غصے سے کچھ کرتا، ایمان نے خاموشی سے چلتے چلتے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا غصے سے اوپر ہوتا پارا اچانک نیچے آنے لگا۔ اس نے صرف ایک لمحے کے لیے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس کے بعد وہ پھر دو قدم آگے ہو کر ابو کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اس نے ابو کے بڑے بڑے ہاتھوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ دے دیئے تھے۔

میں نے ایمان کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں سمندر سے بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے پہلی بار ایمان کے چہرے کے گرد نور کا ایک ہالہ نظر آیا۔

''واہ رے رضوان علی گھمن! کہاں دل کو لگا بیٹھے ہو۔ بڑی جلدی محبت کر بیٹھے ہو۔ محبت کے اس دریا کو پار کرنے کی ابھی تمہاری عمر تو نہیں تھی۔۔۔۔۔ پھر بھی دریا میں کود گئے؟ چلو کبھی تو کنارہ ملے گا۔''

میں نے ایک نظر اسلم کے چہرے کی طرف دیکھا اور واپس گھر آ گیا۔ ابو اسلم سے بات کر کے ایمان کو وہیں اس کے گھر چھوڑ آئے۔ سلم نے اب وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر کبھی ایمان پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ اسلم ابو کی دھمکی سے ڈر گیا تھا اور اب ایمان کا خیال رکھنے لگا۔ ایمان بھی اب خوش رہنے لگی تھی۔ وہ سارا سارا دن اور شام ہمارے گھر میں بھاگتی پھرتی۔۔۔۔۔ زندگی کچھ آسان ہو گئی تھی۔

ایک رات اسلم ایمان کو لینے کے لیے گھر آیا تو ابو اُسے گھر کے اندر لے آئے۔ امی اسلم کے لیے چائے بنانے

لگ گئیں۔جب چائے تیار ہوگئی تو ہم سب اندر کمرے میں چار پائیوں پر بیٹھے چائے پینے لگے۔

''چلو ایمان! اب گھر چلتے ہیں۔'' اسلم چائے پی چکا تو اس نے ایمان سے کہا۔ایمان نے کھانے کا ٹفن پکڑا اور اسلم کے ساتھ جانے لگی۔

''اسلم!'' ابو نے اسلم کو آواز دی تو وہ رک گیا۔

''دیکھو اسلم! ایمان اب بہت خوش نظر آتی ہے۔ مجھے معلوم ہے تم اب ایمان کا خیال رکھنے لگے ہو۔ میں تم سے بڑا ہوں، ایمان کو میں نے بیٹی کہا ہے۔ بڑے ہونے کے ناطے میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا۔

تمہارا کھانا تو ہمارے گھر سے چلا جاتا ہے۔سگریٹ تم پیتے نہیں ہو۔اس لیے تمہاری ساری تنخواہ بچ جاتی ہو گی۔تم ایسا کرو اس گاؤں کے باہر کوئی گھر دیکھ لو۔ پیسہ اکٹھا کرو گے تو چار پانچ سالوں میں تم اپنا گھر لے لو گے۔ کوشش کرو اب پیسہ اکٹھا کرنے کی! ساری زندگی تم نے نوکر بن کر گزاردی ہے۔ایمان اور اس کے بچوں کو نوکر مت بنانا۔۔۔۔۔کوشش کرو باہر نکلنے کی۔

میری زمینوں کے ساتھ دو ایکڑ اراضی کرائے پر خالی ہے۔ میں اسے کرائے پر لے لیتا ہوں۔اگر تم اس پر کام کرنا چاہتے ہو تو دیکھ لو ایک بار اچھی طرح سوچ لو۔۔۔۔۔اس کے بعد بتا دینا۔ میں نے اگر ایمان کے ساتھ کوئی رشتہ بنایا ہے تو پھر میں اس کا کبھی بھی برا نہیں سوچوں گا۔'' ابو نے ایمان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کو باہر تک چھوڑ آئے۔

''ابو! آپ وہ دو ایکڑ کرائے پر لے رہے ہو؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! میرا ارادہ کام کو بڑھانے کا ہے۔ ویسے بھی اب طارق میرے ساتھ مل گیا ہے۔شاید اسلم بھی مل جائے تو پھر کام کو تو بڑھانا پڑے گا نا!'' ابو مجھے سمجھانے لگے۔

''جی ابو جی!'' میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

''ثمینہ! ہمارا بیٹا بہت چپ چاپ سا ہو گیا ہے۔ جب سے اس رات والا واقعہ ہوا ہے یہ بہت سنجیدہ ہو گیا ہے۔اب کسی سے مذاق بھی نہیں کرتا اور ایمان سے بھی کھچا کھچا سا رہتا ہے۔'' میں ان کی باتوں سے بے نیاز چادر

اوڑھے سو گیا تھا۔

دوسرے دن چھٹی تھی اس لیے ایمان صبح صبح ہی ہمارے گھر آ گئی تھی۔

''ثمینہ! جلدی کرو۔۔۔۔ بچوں کو کرکٹ کھیلنے جانا ہے۔ یہ کھانا کھا لیں تو ہم بھی ڈیرے پر چلے جائیں گے۔'' امی روٹیاں پکا رہی تھیں اور ہم سب بہن بھائی چولہے کے اردگرد بیٹھے گرم گرم پراٹھے کھا رہے تھے۔

''راضی! تم بھی کرکٹ کھیلنے جاؤ گے یا گھر میں ہی رہو گے؟'' امی نے پراٹھا میری پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ انہیں امید ہوئی شاید میں اب واپس اپنی زندگی میں لوٹ آیا ہوں۔

''نہیں امی! میں گھر میں ہی رہوں گا۔ میرا سر درد کر رہا ہے۔'' میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

''بیٹا! باہر جایا کرو، سارا دن گھر میں پڑے رہتے ہو۔ تمہاری اس چوبیس گھنٹے کی اداسی نے پورے گھر کا ماحول خراب کر دیا ہے۔ دیکھو اپنے ان بہن بھائیوں کو! کتنے خوش ہوتے تھے ہم لوگ۔۔۔۔۔۔ ہر وقت گھر میں تمہاری شرارتوں سے رونق لگی رہتی تھی۔ اب دیکھو! یہ گھر نہیں قبرستان لگ رہا ہے۔ واپس آ جاؤ بیٹا! اپنا نہیں تو ہمارا ہی خیال کر لو۔ یار خوش رہا کرو!'' ابو مجھے سمجھانے لگے۔

''ابو خوش تو رہتا ہوں اور کیا کروں۔۔۔۔ ان کو خوش کرنے کے لیے اب یہاں ناچنا شروع کر دوں کیا؟'' مجھے ابو کی باتوں پر بلاوجہ غصہ آنے لگا۔

''قسم سے اگر تم ناچنا شروع کر دو نا تو ہم سب ہی اس گھر سے باہر نکل جائیں۔ توبہ! اتنا گندا ڈانس کون برداشت کر سکتا ہے۔'' ایمان نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

یہ حقیقت تھی کہ میں بہت گندا ڈانس کرتا تھا۔ ڈانس کرتے کرتے میں اتنے ہاتھ پاؤں مارتا تھا کہ لوگ مجھ سے دور دور ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایمان اور ارم کئی بار میرے ہاتھوں ڈانس دیکھنے کے چکر میں مار کھا بیٹھے تھے۔ اب وہ مجھے ڈانس کرتا ہوا دیکھ کر کمرے سے باہر نکل جاتے تھے۔

''باقی کیوں باہر جائیں گے! تم کیوں نہیں چلی جاتی۔۔۔۔۔۔ جب دیکھو چوبیس گھنٹے ادھر ہمارے گھر

میں گھسی رہتی ہو۔تمہاری وجہ سے ہمارے پورے گھر کا ماحول تباہ ہو گیا ہے۔'' مجھے ایمان کی بات پر غصہ آ گیا تھا۔

''رضوان! کیا بکواس کر رہے ہو؟ وہ ہمارے اس گھر کی ایک فرد ہے۔'' ابو نے ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ایمان نیچے زمین پر دیکھے جا رہی تھی۔

''چلو ایمان سے معافی مانگو!تم نے غلط بات کہہ کر ایمان کا دل دکھایا ہے۔'' ابو نے غصے سے کہا تو میں نے روٹی چھوڑ دی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیوں ابو! میں ہی کیوں؟ ہر بار میں ہی کیوں معافی مانگتا ہوں۔قصور کسی کا بھی ہو معافی مجھے ہی مانگنا پڑتی ہے۔'' میں نے غصے سے ابو کو جواب دیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر چلا گیا۔

''اوہ یار! یہ پھر ناراض کر اوپر چلا گیا ہے، پتہ نہیں اس لڑکے کا کیا بنے گا۔۔۔۔جاؤ ارم! بھائی کو جا کر لے آؤ، وہ تمہاری بات مان لیتا ہے۔ناشتہ بھی نہیں کیا میرے بیٹے نے۔'' امی نے فکرمندی سے ارم سے بولا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' ایمان بھی ارم کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

''بیٹا! تم رہنے دو! ارم لے آئے گی بھائی کو، اس کی بات مان لیتا ہے۔'' ابو نے ایمان کو روکتے ہوئے کہا لیکن ایمان پھر بھی ارم کے ساتھ ہی چھت پر آ گئی۔

بھائی! ابھی تم ادھر کھڑے ہو گئے ہو! چلو نیچے اتنی جلدی غصہ نہیں کرتے۔دیکھو ہم سب کو آپ کی کتنی فکر ہے۔آپ کی وجہ سے اب باقیوں نے بھی ناشتہ نہیں کرنا ہے۔'' ارم نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

ارم آپ لوگ کرو ناشتہ! قسم سے میرا دل نہیں کر رہا ناشتہ کرنے کو۔'' میں نے ارم کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

میرا ناشتہ کرنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ایمان چوبیس گھنٹے میرے اعصاب پر سوار رہتی تھی۔مجھے ایمان سے محبت ہو گئی تھی۔میں سارا سارا دن صرف ایمان کو ہی سوچتا رہتا تھا۔میرا دن رات کا سکون اور چین ختم ہو گیا تھا۔میں سارا سارا دن بوکھلایا پھرتا تھا لیکن ایمان میرے سامنے بالکل پرسکون ہوتی تھی۔اسے مجھ سے محبت نہیں ہوئی تھی۔

وہ کسی سے بھی محبت نہیں کرتی تھی اور یہی چیز مجھے پاگل بنا رہی تھی۔ میں اس کے سامنے ٹوٹ رہا تھا، بکھر رہا تھا مگر وہ خاموشی سے صرف تماشہ دیکھ رہی تھی۔

''رومیو! چلو نیچے سارے انتظار کر رہے ہیں۔ نیچے سب بھوک سے مر رہے ہیں اور تم یہاں آرام سے چھت پر دھوپ سینک رہے ہو!'' ایمان ایک بار پھر طنز کرنے لگی۔

''میں آرام کر رہا ہوں؟ پچھلے ایک مہینے سے میں مر رہا ہوں، دیکھا ہے کبھی مجھے مسکراتے ہوئے؟ میری ساری زندگی تباہ کر کے رکھ دی ہے اور کہہ رہی ہو میں آرام سے دھوپ سینک رہا ہوں؟ جانتی ہو نا سب کچھ؟''

''راضی! ایک رات نکال جانا!''

''دیکھ لو اب راضی کئی راتیں نکال چکا ہے، کہتی ہو آرام کر رہا ہوں۔ میں مر رہا ہوں ایمان صاحبہ! مر رہا ہوں میں۔'' میں نے ارم کا ہاتھ چھوڑا اور ایمان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''بھائی! کیا ہوا ہے؟ تم اتنے غصے کیوں ہو رہے ہو۔'' ارم کو کسی بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''ارم! تم خاموش رہو، تمہیں کسی بات کا پتہ نہیں ہے۔'' میں نے ارم کو بیچ میں ہی خاموش کروا دیا۔

''ایمان! اب بولو نا؟ یہ نظر آ رہا ہے میرا چہرا؟ میں نے پچھلے ایک مہینے سے ٹھیک طرح سے منہ بھی نہیں دھویا۔ کھانا کھایا ہے یا نہیں کھایا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ سارا دن تمہارا یہ خوبصورت چہرہ دیکھ دیکھ کر جینے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن شاید تمہیں یہ بھی پسند نہیں۔ ایسا کرو! ایک بار ہی ادھر چھت سے دھکا دے دو! مر جاؤں گا تو تمہاری بھی جان چھوٹ جائے گی اور میری بھی زندگی آسان ہو جائے گی۔ گھر والوں کا کیا ہے، ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی اور ہے۔ چار دن رو دھو کے ان کو صبر آ جائے گا۔''

''بھائی! ایسے مت کہو نا؟ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' ارم ایک بار پھر میری طرف بڑھنے لگی۔

''ارم! میں نے کہا ہے نا تم ادھر ہی رکو، یہ میرا اور ایمان کا آپس کا مسئلہ ہے۔ اسے آج سلجھ جانے دو۔ میں تنگ آ گیا ہوں، تیرتے تیرتے کنارے لگنا ہے یا ڈوب جانا ہے۔''

''کچھ تو کہو ایمان! تم اتنی بھی بچی نہیں ہو۔ تمہیں سب پتہ ہے لیکن پھر بھی انجان بنی ہوئی ہو۔ معلوم ہے نا

میں تم سے محبت کرتا ہوں؟'' میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور اپنے سامنے کھڑا کر دیا۔ ہم دونوں چھت کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے۔

''ہاں! معلوم ہے تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ پچھلے ایک مہینے سے میری چاہت میں دھکے کھا رہے ہو لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے، میں تو محبت نہیں کرتی؟ رضوان صاحب! اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں ایک شادی شدہ غلام عورت ہوں۔ میں سانس بھی کسی کی اجازت سے لیتی ہوں تو محبت کیسے کر سکتی ہوں! یہ آزاد لوگوں کے کھیل ہوتے ہیں رضوان صاحب! آپ آزاد ہو، آپ محبت کر سکتے ہو۔ غلام لوگوں کی قسمت میں محبت نہیں ہوتی بلکہ صرف بکنا ہوتا ہے۔ اور میں تیس ہزار میں بک گئی ہوں۔'' وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

''ایمان! تم مجھے جانتی ہو۔ بس ایک بار مجھے کہہ دو کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو، میں ایک ایک شخص کے بیچ میں سے گزر جاؤں گا۔ بس ایک بار مجھ سے محبت کا اقرار کر لو۔'' میں نے اس کا گریبان چھوڑ کر دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔

''ایمان! میں مر رہا ہوں، میں محبت کی آگ میں جل رہا ہوں۔ مجھ سے اکیلے یہ آگ اب مزید برداشت نہیں ہوتی۔ تم ایک بار میری محبت کا جواب محبت سے دے دو، میں تمہاری خاطر پوری دنیا سے لڑ جاؤں گا۔ ایمان! ایک بار آزما کر دیکھ لینا تمہارا یہ راضی تمہارے لیے جان بھی دے دے گا۔'' میں نے ایمان کو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں راضی! جان دینا بہت مشکل ہوتا ہے، کہنے کی بات اور ہے۔ جان کوئی بھی نہیں دیتا اس دنیا میں کسی کے لیے۔ راضی! تم ابھی بہت کچے ہو، محبت میں جان دینے کی باتیں کر کے محبت کی توہین مت کرو۔ یہاں سب اپنے لیے ہی جیتے ہیں۔'' اس نے میرے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹائے اور میرے گالوں کو پیار سے سہلانے لگی۔

''ایمان! تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کر دی ہے۔ مجھے محبت کرنا آ گیا ہے اور جان دینا بھی۔'' میں نے اس کے گالوں کو چھوا اور چھت سے کود گیا۔

میرا چہرہ ایمان کی طرف تھا اور میں نیچے گر رہا تھا۔ میرا ہاتھ لاشعوری طور پر ایمان کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ اچانک ایمان نے بھی میرے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ وہ سیدھی میرے اوپر آ کر گری تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور دونوں ہی تیزی سے نیچے زمین کی طرف جا

رہے تھے۔

مجھے ارم کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چھت کے کنارے پر کھڑی ہمیں گرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ نیچے کچے فرش پر رکھی ہوئی ایک اینٹ سے میرا سر ٹکرایا اور میں بے ہوشی کی گہری تاریکی میں چلا گیا۔ شاید میں نے ایمان کے لیے جان دے دی تھی۔ بے ہوشی سے پہلے آخری احساس ایمان کی فکر تھی۔

''یا اللہ! اسے کوئی خراش مت دینا، اس کے سارے درد اور تکلیفیں آج میرے ہی نصیب میں لکھ دینا۔''

یہ ایمان کی فکر ہی تھی جس نے مجھے زیادہ دیر بے ہوش نہیں ہونے دیا۔ پکی اینٹ سے سر ٹکرانے کی وجہ سے میرا سر پھٹ گیا تھا۔ درد کی ایک تیز لہر میرے سر کے پچھلے حصے میں محسوس ہو رہی تھی۔ ایمان سیدھی میرے سینے پر گری اور لڑھک کر دوسری طرف چلی گئی۔

''ایمان! تم ٹھیک ہو نا!'' ایمان بلندی سے گرنے کے شاک کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

میں نے جلدی سے ایمان کو زور زور سے ہلانا شروع کر دیا، وہ میرے ساتھ ہی پڑی ہوئی تھی۔ میرے سر سے مسلسل خون نکل رہا تھا جس سے میرے اور ایمان کے کپڑے سرخ ہو گئے تھے۔

''ایمان پلیز! پلیز! جانا مت۔۔۔۔ اٹھو ایمان اٹھو! مرنا مت۔۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مرنا مت ایمان۔۔۔۔ راضی کو تمہاری ضرورت ہے۔ مرنا مت ایمان!۔۔۔۔ راضی کو تمہاری ضرورت ہے۔'' میں پاگلوں کی طرح ایمان کو جھنجوڑنے لگا۔

شاید خدا کو میری حالت پر ترس آ گیا۔ ایمان نے ایک گہرا سانس اپنے اندر کھینچا اور کھانسنا شروع کر دیا۔ ہم چھت سے نیچے گلی میں گرے تھے۔ ذرا سی دیر میں سارے گھر والے ادھر اکٹھے ہو گئے۔ میں نے ایمان کو کھانستے ہوئے دیکھا تو مطمئن ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔ سر سے بہت زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے مجھ پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی۔

''اوہ یار! ان کا تو بہت خون نکل رہا ہے۔ طارق! جاؤ نمبرداروں کے گھر۔۔۔ ان کو بولو ٹریکٹر لے کر آ جائیں۔۔۔۔ انہیں ہسپتال لے کر جانا ہے۔ جاؤ یار جلدی کرو بھاگو! یہ دونوں مر جائیں گے۔ یہ چھت سے کیسے گر گئے! اف خدا ہمیں معاف کر دو۔'' ابو نے جلدی سے مجھے اٹھایا۔

ان کا ہاتھ میرے سر کے پچھلے حصے کی طرف گیا جہاں قریباً ۱۳نچ کے قریب سوراخ تھا۔ پچھلی طرف سے میرا سر پچک گیا تھا اور لگاتار خون نکل رہا تھا۔

''یا اللہ خیر! اس کا تو پورا سر ہی پھٹ گیا ہے۔ عامر! جلدی سے کپڑا لاؤ۔۔۔ میں اس کا سر باندھ دیتا ہوں۔ خون بہت نکل رہا ہے۔ راضی۔۔۔! راضی۔۔۔! ہوش میں رہنا یار! میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' ابو مجھے گود میں لیے میرے سارے جسم کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہے تھے۔

چونکہ ہم کچی زمین پر گرے تھے اس لیے ہمیں کوئی بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔ صرف میرا سر ہی اس اینٹ سے ٹکرانے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا۔

''ابو۔۔۔ وہ ایمان کو دیکھو! اسے کوئی چوٹ تو نہیں لگی ہے۔'' میں نے ابو کو ایمان کی طرف متوجہ کیا تو تب انہیں ایمان کا خیال آیا۔

ایمان بھی میرے ساتھ ہی گری تھی۔ اتنی دیر میں محلے کے بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ابو نے مجھے ایک آدمی کے حوالے کیا اور خود ایمان کو دیکھنے لگے۔ میرے سر سے نکلنے والے خون کی وجہ سے ایمان کے سارے کپڑے سرخ ہو گئے تھے۔

''ایمان بیٹی! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' ابو ایمان کو دیکھنے لگے۔

''چاچو! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی آپ راضی کو دیکھو۔۔۔۔ اس کا کافی خون نکل گیا ہے۔'' ایمان ہوش میں آ چکی تھی اور مجھے خون میں لت پت دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔

میری امی سے تو میری خون میں لت پت حالت دیکھی ہی نہیں گئی اور وہ وہیں گھر کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے تھے اور وہ بس خاموشی سے ہم لوگوں کو دیکھ رہی تھیں اور دل ہی دل میں ہماری سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

عامر بھائی کپڑا لے کر آ گئے تو ابو نے اس سے کپڑا لے کر میرا سر کس کر باندھ دیا۔ سر باندھنے کی وجہ سے اگرچہ میرا خون بند تو نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی اس کے نکلنے کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔

نمبردار ٹریکٹر اور ٹرالی لے کر آ گئے تو ابو اور دوسرے لوگوں نے ٹرالی کے اندر چار پائی رکھی اور مجھے اس چار پائی پر لٹا دیا۔

''ابو! وہ۔۔۔۔ایمان۔۔۔ایمان تو ٹھیک ہے نا؟ اسے بھی لے چلو! اسے بھی چوٹ لگی ہے۔'' مجھے ابھی بھی ایمان کی فکر ہو رہی تھی۔

''بیٹا! وہ ٹھیک ہے۔تم حوصلہ رکھو! درد تو نہیں ہو رہا؟'' ابو نے مجھ سے درد کا پوچھا تو تب مجھے درد کا احساس ہونا شروع ہو گیا اور میرے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں نکلنا شروع ہو گئیں۔

میں درد سے چیخ نہیں رہا تھا کیونکہ درد سے چیخنا محبت کی توہین ہوتی ہے اور میں محبت کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ہاں! جب درد حد سے زیادہ ہو جاتا تھا تو کراہیں نکلنے لگتی تھیں۔

''ایمان بیٹی! تم بھی اوپر آ جاؤ،تم یہاں راضی کے ساتھ رہو گی تو اسے اچھا محسوس ہو گا۔'' ابو نے ایمان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایمان ابو کا ہاتھ پکڑ کر ٹرالی کے اوپر آ گئی۔

ٹرالی ہمیں لے کر اڈے پر موجود کلینک جانے لگی۔ٹرالی کے دھچکوں کی وجہ سے میرے سر میں درد کی لہریں سی بننے لگیں۔نمبردار کافی احتیاط سے ٹریکٹر چلا رہا تھا لیکن پھر بھی کچا راستہ تھا۔بہت زیادہ احتیاط کے باوجود دھچکے لگ رہے تھے اور درد میری برداشت سے باہر جا رہا تھا۔آہ۔۔۔آہ۔۔۔ٹرالی کے ہر دھچکے کے ساتھ میری آہیں نکل رہی تھیں۔ایمان میری چار پائی کے اوپر آ کر بیٹھی گئی اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''راضی! بس تھوڑا اور برداشت کر لو۔۔۔۔ہم ہسپتال پہنچنے والے ہیں۔تم بچ جاؤ گے۔۔۔تمہیں کچھ نہیں ہو گا راضی! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔میں دعا کروں گی نا تمہارے لیے۔۔۔بس تھوڑا اور درد برداشت کر لو۔۔۔تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' ایمان میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

میرا درد ختم ہو گیا تھا۔ایمان کے ہاتھوں کی حرارت نے مجھے ہسپتال سے پہلے ہی ٹھیک کر دیا تھا۔صرف سر سے نکلنے والا خون بند ہونا ابھی باقی تھا۔وہاں ٹانکے تو ہسپتال والوں نے ہی لگانے تھے۔زخم دینے والا زخم بھر بھی سکتا ہے۔یہ میرا یقین تھا کہ اگر ایمان محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتی تو میرا خون بھی رک جاتا۔

''راضی! درد تو نہیں ہو رہا ہے؟'' ایمان نے مجھے خاموش ہوتے ہوئے دیکھا تو پوچھنے لگی۔

''نہیں!'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

''ایمان!'' میں نے ایمان کو پکارا تو وہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔

''ایمان! کیا اب بھی میں کچا ہوں؟ کیا مجھے اب محبت کرنا نہیں آتی؟ ایمان! مجھے کسی کے لیے مرنا آ گیا ہے۔'' میں نے ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ ایمان کوئی جواب دیتی ابو جو چار پائی کی دوسری طرف کھڑے تھے ان کو حالات کی سنگینی کا پتہ چل گیا۔ ابو کو میری باتوں سے معاملے کا تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا۔ انہیں شک پڑ گیا تھا کہ چھت سے ہم دونوں غلطی سے نہیں بلکہ کسی اور چکر میں گرے تھے۔ چونکہ ٹرالی پر اور بھی بہت سارے لوگ تھے جو مجھے لے کر ہسپتال جا رہے تھے۔ ابو مجھ سے مخاطب ہوئے؛

''رضوان بیٹا! تم باتیں مت کرو۔۔۔۔۔بس خاموش رہو! باتیں کرنے سے تمہارا سر ہلتا ہے اور خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔'' انہوں نے میری بات کو درمیان میں ٹوک دیا تھا۔

انہیں معلوم تھا کہ اگر میں تھوڑی دیر اور بولتا رہتا تو سارے لوگوں کو اس حقیقت کا پتہ چل جاتا۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ اگر گاؤں والوں کو پتہ چل جاتا کہ میں ایمان سے محبت کرنے لگا ہوں تو مجھے اور ایمان کو تو جو سزا ملتی سو ملتی، گاؤں والے میرے سارے گھر والوں کا جینا حرام کر دیتے۔ یہ حقیقت تھی۔ ایمان ایک شادی شدہ لڑکی تھی۔ اسے تیس ہزار میں خرید کر اس گاؤں میں لایا گیا تھا۔

یہاں سب کچھ جائز تھا لیکن اگر کوئی شادی شدہ عورت کسی غیر مرد کے ساتھ محبت کرتے ہوئے پکڑی جاتی تو پورے گاؤں والے دونوں کا منہ کالا کر کے بیچ چوراہے میں الٹا لٹکا کر اتنا مارتے تھے کہ ان کو چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا تھا۔ گاؤں والے اس جوڑے کو عبرت کا نشان بنا دیتے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو نصیحت ملتی تھی۔

مجھے اور ایمان کو یہ معلوم تھا کہ اگر ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوئے پکڑے گئے تو گاؤں والے ہماری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ ایمان کی حیثیت ہی کچھ ایسی تھی کہ میرے گھر والے چاہ کر بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے ابو نے مجھے مزید بولنے سے روک دیا تھا۔ وہ ہم دونوں کو اکیلے میں سمجھانا چاہتے تھے۔

''ایمان! تم چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھ جاؤ۔۔۔۔رضوان کے پاؤں پکڑ کر رکھو۔۔۔ادھر سے میں پکڑ لیتا ہوں۔اس سے رضوان کو جھٹکے کم لگیں گے۔'' ابو ایمان کے پاس آ گئے اور اسے وہاں سے ہٹا کر خود میرے پاس بیٹھ گئے۔

انہوں نے ایمان کو بیٹی کہنے سے گریز کیا تھا۔شاید وہ ایمان کو اپنی ناراضگی بتانا چاہتے تھے۔ایمان خاموشی سے جا کر پائنتی کی طرف میرے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے سر کا درد اب پاؤں میں محسوس ہونے لگا تھا۔اس کے ہاتھوں میں نرمی اور محبت ہی ایسی تھی کہ مجھ پر غنودگی چھانے لگی۔اگلے ہی پل میں ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔

اب کی بار مجھے ہوش ہسپتال کے بستر پر ہی آیا۔ڈاکٹر میرے سر پر ٹانکے لگا کر پٹی باندھ چکا تھا۔ہسپتال میں شاید مجھے کلوروفام سے بے ہوش کر کے ٹانکے لگائے تھے۔اس لیے میں دس بارہ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔اب شام ہو رہی تھی، جب مجھے ہوش آئی۔

''امی! ایمان کہاں ہے؟ وہ ٹھیک ہے نا؟ اسے کوئی زخم تو نہیں آیا؟'' میں نے ہوش میں آتے ہی دائیں بائیں نظر دوڑائی تھی۔ہسپتال میں اس وقت ایمان کے سوا سارے ہی موجود تھے۔ارم میرے بستر کے پاس کرسی پر بیٹھی سیب کاٹ رہی تھی۔امی زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ اندر شکرانے کے نفل ادا کرنے چلی گئیں۔

''ارم! ایمان کدھر ہے۔۔۔۔۔۔وہ نظر نہیں آ رہی؟'' ارم نے میری طرف کاٹے ہوئے سیبوں کی پلیٹ بڑھائی تو میں نے پلیٹ پکڑ کر بستر پر رکھ دی۔

''ارم! ایمان کدھر ہے؟'' میں نے غصے سے ارم کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

ارم نے مجھے اور ایمان کو چھت سے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔اسے اس سارے معاملے کا پتہ چل گیا تھا۔اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں اس کی سہیلی ایمان سے محبت کرتا ہوں۔اسے مجھ سے اور ایمان دونوں سے محبت تھی۔ میں نے اسے لاعلم رکھ کر یہ سب کچھ کیا تھا اس لیے وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔

''ایمان کو میں نے گھر بھیج دیا ہے، اب وہ یہاں نہیں آئے گی۔'' ابو نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ابو! ہم گھر کب جائیں گے؟ میرا سر اب ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ میرا پاؤں چھت سے پھسل گیا تھا۔ ایمان مجھے بچانے کے لیے آگے آئی تو وہ بھی میرے ساتھ ہی نیچے گر گئی۔'' میں ایمان سے ملنے کے لیے بے چین تھا جس کے لیے چھت سے چھلانگ لگائی تھی۔ جس لڑکی کی خاطر میں سپر مین بن گیا تھا اگر وہی نظروں کے سامنے نہیں تھی تو پھر کیا فائدہ۔

''ابو! ہم گھر جا رہے ہیں نا!'' میں ابو سے پوچھنے لگا۔

''نہیں رضوان بیٹا! تمہارے سر میں دس ٹانکے لگے ہیں۔ زخم ابھی تازہ ہے اس لیے آج رات ہم ادھر ہی رکیں گے۔ کل دن کو اگر ڈاکٹر نے اجازت دے دی تو پھر چلے جائیں گے۔'' میری حالت دیکھ کر ابو اندر سے ٹوٹ گئے تھے۔

آنے والے وقت سے وہ بھی خوفزدہ تھے۔ شک تو ان کو ٹرالی میں ہی ہو گیا تھا۔ چونکہ ارم ہمارے ساتھ ہی چھت پر تھی اور اسے ساری بات کا پتہ تھا اس لیے انہوں نے ارم کو علیحدہ بٹھا کر ساری بات پوچھ لی تھی۔

''راضی بیٹا!'' ابو میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''راضی بیٹا! جن راہوں پر تم چلنے لگے ہو، جن راہوں کے تم مسافر بن رہے ہو وہاں سوائے دکھ اور رسوائی کے کچھ نہیں ہے۔ بیٹا! تمہاری ایک فیملی ہے، ماں باپ ہیں، بہن بھائی ہیں۔ وہ ایک شادی شدہ لڑکی ہے۔ تمہاری یہ محبت ہمارے پورے خاندان کو برباد کر کے رکھ دے گی۔ بیٹا! تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔۔۔۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔

یہ کوئی فلم نہیں ہے جس میں تم سب سے لڑ جھگڑ کر آخر میں لڑکی لے جاؤ گے۔ یہاں یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ یہ گاؤں والے تم دونوں کو کبھی بھی ملنے نہیں دیں گے۔ وہ تیس ہزار میں خرید کر لائی گئی بیوی ہے۔ گاؤں والے تم دونوں کو مار دیں گے اور میں تمہیں بچانے کے چکر میں خود بھی مارا جاؤں گا۔ بیٹا! ہمارا معاشرہ محبت کو قبول نہیں کرتا۔ میں اور تمہارے یہ بھائی تمہاری اس بے جوڑ محبت کی بھینٹ چڑھ کر مارے جائیں گے۔ واپس آ جاؤ بیٹا! محبت ہم غریب لوگوں کو راس نہیں آتی۔'' وہ میرے کپڑوں پر لگی ان دیکھی مٹی صاف کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''راضی! میں باپ ہوں تمہارا، تمہیں مرتا ہوا نہیں دیکھ سکوں گا۔'' وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''ثمینہ! میں ڈاکٹر کو دیکھ کر آتا ہوں۔'' وہ اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے باہر گئے تھے۔

مجھے ابو کی بات کی سمجھ آ گئی تھی۔ رات ادھر ہسپتال میں ہی گزار کر دوسرے دن ہم لوگ گھر آ گئے۔ پچھلے دو دن سے ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔ کھانا نمبرداروں کے گھر سے ہی آ جاتا تھا۔ انہوں نے ایک نوکر کو ہمارے ڈیرے پر بھی بھیج دیا تھا۔ ابو کی غیر موجودگی میں وہی جانوروں کو چارہ وغیرہ دیتا رہا تھا۔ عامر اور ارم بھی دو دن سے سکول نہیں گئے تھے۔ امی نے گھر آتے ہی چولہے میں لکڑیوں سے آگ جلائی اور چائے کا پانی رکھ دیا۔ سر کی چوٹ کی وجہ سے مجھ میں تھوڑی کمزوری آ گئی تھی لیکن میں چل پھر سکتا تھا۔ ابو نے مجھے سہارا دے کر صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بٹھا دیا۔

''ابو! میں ایمان باجی کو بلا کر لاتا ہوں، اسے بتاؤں گا کہ راضی بھیّا ہسپتال سے گھر واپس آ گئے ہیں۔'' عامر ایمان کو بلانے کے لیے باہر جانے لگا تو ابو نے اسے روک دیا۔

''نہیں عامر! کوئی ایمان کو بلانے نہیں جائے گا۔ آج کے بعد اس گھر میں ایمان نہیں آئے گی۔ تم میں سے جس کو بھی ایمان سے ملنا ہو وہ اس کے گھر جا سکتا ہے لیکن وہ اس گھر میں نہیں آئے گی۔ میں خود اس کو منع کر کے آتا ہوں۔ اور ہاں! ایک اور بات۔۔۔ راضی آج کے بعد اگر مجھے پتہ چلا کہ تم ایمان سے ملے ہو یا اس سے ملنے کی کوشش کی ہے تو لوگوں نے تجھے کیا مارنا ہے۔۔۔ میں خود ہی تمہاری ٹانگیں توڑ کر تمہارے ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔ اس گھر کے چار چار مرد مل کر ایک آدمی کو چارپائی پر بٹھا کر ساری زندگی روٹی کھلا سکتے ہیں۔'' انہوں نے غصے سے گرجتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

ایمان نے ٹریکٹر کی آواز سن لی تھی۔ وہ ہمارے گھر کی طرف ہی آ رہی تھی۔ ابو نے اسے گلی میں ہی روک لیا اور واپس اسے اس کے گھر لے گئے۔

''ایمان بیٹی! تمہیں ہمارے اس گاؤں میں آئے ہوئے اڑھائی سال ہو گئے ہیں۔'' انہوں نے ایمان کو چارپائی پر بٹھایا اور اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔

''بیٹا! اتنے سالوں میں تم ہمارے گھر آتی رہی ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی ہی سمجھا ہے۔ کبھی میں نے تم

میں اور ارم میں فرق محسوس کیا ہے؟'' ابو نے ایمان سے سوال کیا تو ایمان نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بیٹا! ہم نے ہمیشہ تمہیں پیار ہی دیا ہے۔لیکن آج میں بہت مجبور ہو کر تمہارے گھر آیا ہوں۔''

''چاچو! کیا بات ہے؟ آپ کھل کر بات کرو نا! مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'' ایمان ابو کی باتیں سن کر تھوڑی پریشان ہو گئی۔

''بیٹا! راضی تم سے محبت کرتا ہے، کیا تمہیں اس بات کا پتہ ہے؟''

''جی چاچو جی! مجھے پتہ ہے کہ راضی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ چھت سے چھلانگ بھی اس نے میرے لیے ہی لگائی تھی۔'' ایمان ابو کی باتیں سن کر انہیں سچ بتانے لگی۔

''کیا تم بھی اس سے محبت کرتی ہو؟'' ابو نے ایمان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چاچو! آپ صاف بات کرو!'' ایمان نے جواب دینے سے گریز کیا۔ابو نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

''بیٹا! تم ایک شادی شدہ لڑکی ہو۔اگر تم بھی راضی سے محبت کرتی ہو تو پھر اس معاشرے سے کیسے لڑو گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری یہ محبت دونوں گھروں کو لے ڈوبے گی۔'' ابو ایمان کے دونوں ہاتھ پکڑے اسے بتا رہے تھے۔

''چاچو! محبت خود ہی راستہ نکال لیتی ہے۔'' ایمان ابو کو سمجھانے لگی۔

''نہیں بیٹا! محبت راستہ نہیں نکالتی۔۔۔۔یہ راستہ تباہ کر دیتی ہے۔میں ایک مجبور اور بے بس باپ ہوں، میں ان گاؤں والوں سے نہیں لڑ سکتا اس لیے تمہارے پاس بھیک مانگنے آیا ہوں۔ بیٹا! میں خود چل کر تمہارے پاس آیا ہوں۔میں نے اڑھائی سال تمہیں بیٹی کہا ہے۔میری اس زبان کی لاج رکھ لو۔ مجھے آج خالی ہاتھ مت لوٹانا۔'' ابو چارپائی سے اٹھ کر ایمان کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

''چاچو! کیا کر رہے ہو، آپ میرے باپ کے جیسے ہو۔آپ جو بھی کہو گے میں کروں گی لیکن آپ یوں مت کرو۔'' ایمان جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔اس نے ابو کا ہاتھ پکڑ کر اسے چارپائی پر بٹھا لیا اور خود ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''بیٹا! میں بہت مجبور ہو کر آیا ہوں۔'' ابو نے ایمان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''چاچو! آپ بولو کیا بولنا چاہتے ہو!'' ایمان نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! آج کے بعد تم ہمارے گھر میں نہیں آؤ گی اور نہ ہی راضی سے ملو گی۔'' ابو نے ایمان سے کہا تو ایک لمحے کے لیے ایمان ڈگمگا گئی۔

''ٹھیک ہے چاچو! آج کے بعد نہ ہی میں آپ کے گھر آؤں گی اور نہ ہی راضی سے ملوں گی۔'' ایمان نے ابو کو جواب دیا اور ابو کے قدموں سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ ابو گھر واپس آ گئے۔

میرے زخم ٹھیک ہونے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ تب تک گھر والوں نے میری خوب خدمت کی۔ ایمان نے ابو سے وعدہ کیا تھا اس لیے وہ ہمارے گھر نہیں آئی۔ میں روزانہ دروازے کی طرف دیکھتا رہتا تھا لیکن ایمان اس کے بعد دوبارہ کبھی نہیں آئی۔ شاید محبت اتنی ہی کمزور ہوتی ہے، وہ ابو کی ذرا سی دھمکی سے ڈر گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر کوئی فقیر آ کر صدا لگانے لگا۔

''اللہ کے نام پر دے دو بابا! اللہ کے نام پر۔۔۔۔'' وہ بلند آواز میں صدا لگا رہا تھا۔

''راضی بیٹا! ادھر مٹکی سے تھوڑا آٹا لے کر فقیر کو دے آؤ، خدا ان فقیر لوگوں کی بہت سنتا ہے۔'' امی نے مجھے کمرے سے آواز دی تو میں نے مٹکی سے ایک پلیٹ میں تھوڑا آٹا لیا اور بیرونی دروازہ کھول کر فقیر کو سلام کرنے لگا۔

''سلام بابا! یہ لو آٹا اور دعا کر دو کہ خدا سب ٹھیک کر دے۔''

''جی بیٹا، وہ تو سب ٹھیک کر دیتا ہے۔ اس کا تو کام ہی ٹھیک کرنا ہے۔'' فقیر نے عجیب سے فلسفیانہ انداز سے کہا اور میرے ہاتھ سے پلیٹ پکڑ کر آٹے کو جھولے میں ڈالا اور خالی پلیٹ میری طرف بڑھا دی۔

''بیٹا! محبت اتنی کمزور نہیں ہوتی جتنی تم سمجھ بیٹھے ہو۔۔۔۔۔۔ عشق کی راہیں بہت دشوار ہوتی ہیں۔ اپنی روح کو فنا کرنے کا نام ہی عشق ہے اور یہ قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔'' وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور مڑ کر دوسرے گھر کی طرف چل دیا۔

''اللہ کے نام پر دے دو بابا! اللہ کے نام پر دے دو بابا۔۔۔'' وہ ایمان کے گھر کے دروازے پر کھڑا صدا لگا

رہا تھا۔

''اللہ کے نام پر دے دو بابا۔۔'' فقیر نے تیسری صدا لگائی تو دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔

ایک ہفتے سے آنکھیں دیدار کے لیے ترس رہی تھیں۔خدا نے آج اس فقیر کو ہمارے وصل کا وسیلہ بنا کر بھیجا تھا۔دروازے کے کھلنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ایمان ہاتھ میں آٹے کی پلیٹ لیے باہر آگئی۔سفید رنگ کے کپڑوں میں اس کا گورا سفید چاند کی طرح چمکتا ہوا چہرہ۔۔۔۔۔وہ جنت سے آئی ہوئی حور ہی لگ رہی تھی۔اسے میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا لیکن وہ میری طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

''ایمان!'' میں نے اسے آہستہ سے آواز دی۔

''بابا! آپ جلدی سے آٹا لے لو، مجھے گھر میں بہت کام ہیں۔'' ایمان کی آواز لڑکھڑانے لگی۔

''بیٹا! یہ جو محبت ہوتی ہے نا! یہ تو خدا کی بھی نہیں مانتی۔۔۔ یہ تو خدا کی خدائی کے سامنے بھی ڈٹ جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔پھر تمہیں کیسے ایک شخص کی قسم نے باندھ رکھا ہے۔'' ابو نے اسے اپنی قسم دی ہوئی تھی کہ وہ مجھ سے کبھی نہیں ملے گی۔اسی قسم نے ایمان کو مجھ سے ملنے سے روک رکھا تھا۔

''بیٹا! محبت میں قسمیں نہیں ہوتیں۔۔۔۔محبت میں صرف محبت ہی ہوتی ہے۔'' فقیر نے ایمان سے آٹا لیا اور اپنی راہ پر چل پڑا۔

''ایمان!'' اس بار میں نے ذرا اونچی آواز میں اسے پکارا تو وہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''ایمان!'' میں اس کے پاس آ کر رک گیا تھا۔

''ایمان! میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔تمہارے دیدار کے بغیر میں نے ان سات دنوں کو ایک ایک پل کر کے گزارا ہے، تمہارے بغیر میری زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ایمان! کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' میں نے التجائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

میری حالت اس مجرم کی طرح ہو رہی تھی جسے کسی بھی وقت جج موت کی سزا سنا سکتا تھا۔

''ایمان! کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' میں نے ایک بار پھر ایمان سے پوچھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ہاں راضی! میں بھی تجھ سے محبت کرتی ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ اس پل سے جب میں تمہارے گاؤں آئی تھی۔ راضی! میں تمہارے گھر صرف تمہارے لیے جاتی تھی۔ مجھے پہلے دن سے ہی تجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں ہمیشہ تم سے جھوٹ بولتی تھی کہ مجھے کسی سے محبت نہیں ہے کیونکہ میں ان گاؤں والوں سے ڈرتی تھی، مجھے آج بھی ڈر لگتا ہے۔ راضی! خدا بھی بہت سی ناانصافیاں کر جاتا ہے۔ پتہ نہیں ہم دونوں کا انجام کیا ہوگا، کہیں ہماری یہ محبت ہمارے گھر والوں کو تباہ نہ کر دے۔'' وہ میرے گلے سے لگ کر رونے لگی۔

رونا مجھے بھی آ رہا تھا اور ڈر بھی لگ رہا تھا۔ آنے والے دن ہماری زندگیوں میں مزید درد لانے والے تھے لیکن میں حوصلہ کر کے کھڑا رہا۔ میں ایمان کے کندھے کو تھپتھپا رہا تھا، مجھے ایمان کو حوصلہ دینا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور دونوں ہی ان گاؤں والوں سے ٹکرانے والے تھے۔ انجام کچھ بھی ہوتا۔۔۔ مارتے یا مارے جاتے، فتح ہمیشہ محبت کی ہوتی۔

''ابو! ایمان کو تیس ہزار میں خریدا گیا تھا نا؟'' ابو چولہے کے پاس بیٹھے روٹی کھا رہے تھے جب میں نے سوال کیا۔

''ہاں! کیوں کیا ہوا؟ آج تم ایمان سے ملے تھے کیا؟'' ابو نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ ان کے ہاتھ سے روٹی کا نوالہ گر گیا تھا۔

''جی ابو! میں ایمان سے ملا تھا۔'' میں نے ابو سے سچ بولنے کا ارادہ کر لیا۔

''بیٹا! میں نے تم کو روکا بھی تھا، ایمان کو اپنی قسم بھی دی تھی لیکن تم لوگ پھر بھی باز نہیں آئے۔''

میرا اندازہ تھا کہ ابو بہت غصہ کریں گے اور وہ ماریں گے بھی لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ خلافِ معمول وہ نارمل رہے۔ البتہ ان کے چہرے پر آئی ہوئی لاتعداد لکیریں ان کی پریشانی کا حال بتا رہی تھیں۔

''ابو! کیا ہم اسلم کو تیس ہزار دے کر اس سے ایمان کو نہیں لے سکتے؟ آپ اسلم کو تیس ہزار دے دو اور ایمان

مجھے لے کر دے دو۔ ابو میں سخت محنت کر کے تیس ہزار کما لوں گا، میں کل سے فیکٹری چلا جایا کروں گا۔ میں ایک ایک روپیہ اکٹھا کر کے آپ کو دوں گا، آپ بس ایمان کو لا کر مجھے دے دو مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ ابو! آپ ایمان کو خرید کر اپنے پاس رکھ لو، میں فیکٹری سے پیسے لا لا کر آپ کو دوں گا جب تیس ہزار ہو جائیں تو پھر ایمان مجھے دے دینا۔ آپ بس ایمان کو خرید کر اپنے پاس رکھ لو۔'' میں زمین پر بیٹھا روئے جا رہا تھا۔ الفاظ پھسل پھسل کر میرے منہ سے نکل رہے تھے۔

''ابو! میں مر جاؤں گا۔'' میرے حلق میں گولا سا بن گیا اور مجھ سے مزید بولا نہ گیا۔

''اوہ میرے غریب بیٹے!'' ابو نے میرے پاس آ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

''راضی بیٹا! تم کیا سمجھتے ہو میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے؟ بیٹا! تم دونوں کو الگ الگ کر کے مجھے بھی رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ میں پچھلے ایک ہفتے سے اسی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ تم تیس ہزار کی بات کرتے ہو، میں نے اسلم کو ایک لاکھ روپے دینے کی بات کی تھی لیکن وہ نہیں مانا۔ بیٹا! تمہارے اس باپ نے نمبرداروں کے گھر میں بیٹھ کر اس اسلم کے پاؤں بھی پکڑ لیے تھے۔''

''ابو! آپ بہت کچھ کر سکتے ہو۔۔۔۔۔۔ پلیز! ابو کچھ تو کرو۔'' میرا دل ابھی بھی نہیں مان رہا تھا۔

''بیٹا! یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اگر وہ ایمان کو طلاق دینے پر راضی نہ ہوا تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہی اس ملک کا قانون کہتا ہے کیونکہ وہ اس کی بیوی ہے۔ بے شک ہم گاؤں والوں نے اسے ۳۰ ہزار اکٹھے کر کے دیئے تھے مگر اب وہ اس کی ملکیت ہے۔ وہ ایک لاکھ روپیہ پر بھی نہیں مان رہا ہے۔''

''ابو میں مر جاؤں گا! آپ کچھ کر لو!'' میں ابو کے گلے لگ کر رونے لگا۔ زندگی میں کبھی نہ رونے والا رضوان آج بات بات پر رونے لگ جاتا تھا۔

''حوصلہ رکھو بیٹا! میں کچھ کرتا ہوں۔ تم بس کوئی غلطی مت کرنا! اس سے پہلے کہ تمہاری اور ایمان کی محبت کی خبر گاؤں والوں کو ملے، میں ایمان کو خریدنے کی ایک بار پھر کوشش کرتا ہوں۔ تم بس کوئی غلطی مت کرنا! کوئی غلطی مت کرنا راضی!'' ابو نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''طارق! تم اپنے تایا کے گھر جاؤ اور ان کو بولنا کہ باقی بھائیوں اور دوسری برادری کو بھی لے کر نمبردار کے گھر آ جائیں۔ میں نمبردار کے گھر ہی جا رہا ہوں، آج برادری کو بیچ میں ڈال کر بات کرتا ہوں شاید کام بن جائے نہیں تو کل کو میں برادری کو لے کر پنچائیت میں چلا جاؤں گا۔'' ابو نے طارق کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

''جی ابو جی! طارق بھائی اٹھ کر باہر نکلے اور فیاض تایا کے گھر کی طرف چل دیئے۔

''ثمینہ! دعا کرنا۔۔۔۔خدا ماؤں کی دعائیں بہت جلدی سن لیتا ہے۔'' ابو امی کو دعا کرنے کا بول کر باہر چلے گئے۔

میں بھی ابو کے ساتھ ہو لیا۔ ابو باہر نکل کر ایمان کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایمان ہی دروازہ کھولنے آئی۔

''ایمان بیٹی! اسلم کدھر ہے؟ اسے بولو میرے ساتھ نمبردار کے گھر چلنا ہے۔''

''جی چاچو جی!'' ابو نے ایمان سے اسلم کو بلانے کا کہا تو وہ اسلم کو بلانے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسلم چپل پہنتا ہوا باہر آ گیا۔

''جی چوہدری صاحب! کیا کام ہے نمبردار کے گھر میں؟'' اسلم میرے ابو کو چوہدری ہی کہتا تھا۔

''چلو! تم سے کچھ بات کرنی ہے!''

''ایمان بیٹی! تم ہمارے گھر چلی جاؤ، ہمیں شاید دیر ہو جائے گی۔'' ابو نے ایمان کو ہمارے گھر آنے کی اجازت دے دی تھی۔

ایمان یہ سن کر خوش ہو گئی اور جلدی جلدی ہمارے گھر کی طرف چلنے لگی اور ہم اسلم کو لے کر نمبرداروں کے گھر چلے گئے۔

نمبرداروں نے رات کو کچے دودھ کی نمکین لسی بنائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ہمیں ایک ایک گلاس لسی کا دیا۔ ابو اور اسلم نے تو اپنا اپنا گلاس خالی کر دیا لیکن مجھ سے لسی پی ہی نہیں گئی۔ میں نے بغیر پیئے ہی لسی کا گلاس واپس رکھ

دیا۔

تھوڑی دیر بعد طارق بھائی پوری برادری کو لے کر آ گئے تو ابو نے ایمان کی بات شروع کر دی۔ پوری برادری مل کر اسلم پر زور دیتی رہی کہ وہ ایمان کو چھوڑ دے اور ایک لاکھ روپیہ لے کر اپنی کوئی دکان وغیرہ بنا لے۔ اس زمانے میں ایک لاکھ روپیہ بہت بڑی رقم تھی۔ اتنی رقم سے کریانے کی بہت بڑی دکان بن سکتی تھی۔ وہ اگر دکان بنا لیتا تو ساری زندگی دکان پر بیٹھ کر کھاتا رہتا اور اسے نمبرداروں کے ہاں نوکری کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ لیکن اسلم نہیں مانا، وہ اپنی بات پر قائم رہا۔

''نمبردار صاحب!'' اس نے نمبردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں غریب ضرور ہوں، آپ کا نوکر ہوں لیکن غریب آدمی کی بھی عزت ہوتی ہے۔ ایمان میری بیوی ہے، آپ یوں برادری کو اکٹھا کر کے مجھ سے میری بیوی نہیں لے جا سکتے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باہر چلا گیا۔

ابو نے برادری والوں کا شکریہ ادا کیا اور ہم سب اپنے اپنے گھروں کو ناکام واپس چلے گئے۔ دوسرے دن ابو نے پنچائیت بلا کر اسلم کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن اسلم اپنی ضد پر قائم رہا۔ چونکہ ایمان اسلم کی بیوی تھی اس لیے پنچائیت بھی ہمارے لیے کچھ نہ کر سکی۔

اسلم ایمان کو لے کر اس گاؤں کو چھوڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر وہ ایمان کو اسی گاؤں میں رکھتا تو کوئی ایمان کو اس سے چھین کر لے جائے گا۔ چونکہ اس کا اس گاؤں میں کوئی بھی نہیں تھا، اس لیے اس نے اس گاؤں کو ہی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن یہاں پر ابو نے ٹانگ اڑا دی۔ چونکہ ایمان کے لیے گاؤں والوں نے پیسے اکٹھے کر کے اسلم کو دیئے تھے اس لیے پنچائیت نے اسلم کو گاؤں چھوڑنے سے منع کر دیا۔

''اسلم اگر گاؤں چھوڑنا چاہتا ہے تو چھوڑ کر جا سکتا ہے لیکن ایمان اس گاؤں سے باہر کبھی نہیں جائے گی۔'' پنچائیت نے اپنا فیصلہ سنایا اور ابو آدھی ادھوری فتح حاصل کر کے گھر آ گئے۔

مجھے اور ایمان کو اب سارے راستے بند نظر آنے لگے۔ اسلم کبھی بھی ایمان کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا تھا اور گاؤں میں رہ کر میں کبھی بھی ایمان کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اور ایمان نے مل کر اس گاؤں سے بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابو نے کہا تھا کہ راضی بیٹا! کوئی غلطی مت کرنا۔۔۔۔۔ لیکن وہ محبت ہی کیا جس میں غلطی

نہ ہو۔

''ایمان! کہیں ہم کوئی بہت بڑی غلطی تو نہیں کر رہے؟'' رات کو میں ایمان کو اس کے دروازے پر چھوڑنے آیا تو گلی میں رک کر اس سے پوچھنے لگا۔ہم نے اگلے دن صبح گھر سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

آج رات ابو قصائی سے قریباً دو ہزار روپے لے کر آئے تھے۔ ابو نے گائے کا ایک بچھڑا بیچ دیا تھا۔ ان پیسوں سے دوسرے دن شام کو ابو نے فصل کے لیے بیج خریدنا تھا۔انہوں نے پیسے امی کو دیئے تو امی نے پیسے کپڑوں کے ایک پرانے باکس میں رکھ دیئے تھے جو تالے کے بغیر تھا۔ میں نے پیسے نکال کر ایمان کو بھگا لے جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ میں دن کو پیسے وہاں سے نکال لیتا اور ہم دونوں کراچی بھاگ جاتے۔

دو ہزار روپے ایک خطیر رقم تھی، ہمارا کراچی شہر میں ایک مہینہ آرام سے گزر جاتا۔اس کے بعد میں کسی فیکٹری میں کوئی کام دیکھ لیتا تو گھر کا خرچہ چلتا رہتا، زندگی بے شک گھر والوں سے دور رہ کر گزرتی۔تھوڑی تکلیف تو تھی مگر ایمان کی محبت کے آگے ساری تکلیفیں ختم ہو جاتیں۔محبوب کا ساتھ ہو، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ہو تو زندگی اچھی ہی گزرتی ہے۔

''ایمان! کہیں ہم غلط تو نہیں کر رہے ہیں؟ میں لڑکا ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں۔تمہاری خاطر بڑے سے بڑے حالات سے بھی گزر جاؤں گا لیکن مجھے خود سے زیادہ تمہاری فکر ہے۔ ہماری اس غلطی سے کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ایمان! میں تمہاری تکلیف نہیں دیکھ سکوں گا۔'' میں نے ایمان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''نہیں راضی! یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ہم ساری زندگی اس گاؤں میں ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے۔ عذاب تو میں پچھلے تین سال سے بھگت ہی رہی ہوں، اس سے بڑا عذاب اور کون سا ہوگا۔'' ایمان نے مجھے دلاسہ دیا تو میں نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

''راضی! ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے نا! زندگی کیسی بھی ہو، کل کو جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے تو ہمارے ذہن پر یہ بوجھ تو نہ ہوگا کہ ہم نے کوشش ہی نہیں کی تھی، شاید ہم کوشش کرتے تو کامیاب ہو جاتے۔کل کو یہ پچھتاوا تو نہیں رہے گا! کوشش تو کریں گے نا آخری سانس تک، کامیابی یا ناکامی کا اختیار تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔خدا بہتر کرے گا۔'' وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور میں وہیں گلی میں کھڑا سوچتا رہا۔

اگلا دن ہم دونوں کے لیے بھاری تھا۔صبح اٹھ کر سارے گھر والے ناشتہ کرنے لگےلیکن میں سر درد کا بہانہ بنا کر لیٹا رہا۔ مجھے آج سکول نہیں جانا تھا۔گھر والے ناشتہ کر کے اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے۔امی بھی ابو کے ساتھ ڈیرے پر چلی گئی۔

مجھے اور ایمان کو گھر میں چھوڑ کر سب لوگ چلے گئےتو میں نے جلدی سے کمرے میں گیا اور باکس سے پیسے نکال کر گنےتو وہ دو ہزار تین سو روپے تھے۔میں نے ایک بار پھر احتیاط سے پیسے گنےاور آدھے پیسے خود رکھے اور آدھے پیسے ایمان کو پکڑا دیئے۔ہم دونوں نے اپنے دو دو چار چار کپڑے لفافے میں ڈالے اور گھر سے باہر نکلنے لگے۔

میں گھر کے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر دروازے کے اوپر چڑھ کر دوسری طرف گلی میں کود گیا۔ ایمان نے امی کی ایک بڑی چادر لے کر اس سے اپنے چہرے کو اچھی طرح ڈھانپ لیا۔میں نے آخری بار اپنے گھر کی طرف دیکھا اور ایمان کا ہاتھ پکڑ کر گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔

ہم پیدل ہی چلتے چلتے آدھے گھنٹے میں اڈے پر پہنچ گئے۔وہاں سے ہمیں بہاولپور شہر جانے والی کوچ مل گئی۔بہاولپور سے آگے ہمیں کراچی والی بس میں بیٹھنا تھا۔بہاولپور پہنچ کر ہم نے پانی کی ایک بوتل اور بسکٹ کا ایک ڈبہ لیا اور کراچی جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔

''راضی!سب کچھ ٹھیک تو ہو جائے گا نا؟'' ایمان نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھتے ہوئے کہا۔ہم بس کے اندر سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔

''ہاں ایمان!اب حوصلہ رکھو!خدا ہم محبت کرنے والوں کے ساتھ ہے۔جب ایک بار گھر سے باہر قدم رکھ دیا تو پھر ڈر کیسا؟جو بھی حالات ہوں گے ہم ان کا مل کر مقابلہ کریں گے۔'' میں ایمان کے کندھے کو تھپتھپا کر اسے حوصلہ دینے لگا۔

جب بس سواریوں سے بھر گئی تو آہستہ آہستہ بس ٹرمینل سے باہر نکلنے لگی۔بس سٹیشن شہر کے درمیان میں تھا اس لیے بس کو شہر سے باہر نکلنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ہم خیریت سے شہر سے باہر نکلے اور بس اپنی پوری رفتار سے کراچی کی طرف گامزن ہو گئی۔

ساری رات گھر سے بھاگنے کی پریشانی، نیا شہر، نئے لوگ، نئی پریشانیاں۔ ایمان کو شاید پوری رات نیند نہیں آئی تھی۔ اس لیے اسے جب میرے کندھے کا سہارا ملا تو وہ دنیا کی ہر فکر سے آزاد ہو کر سو گئی۔

''ایمان!'' میں نے اسے ہلکی سی آواز دی، وہ سو رہی تھی۔

میں نے احتیاط سے اس کا سر اپنے کندھے سے علیحدہ کیا اور اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ میری گود میں سر رکھے سو رہی تھی اور میں اسے سوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

''واہ رے خدا! تو کتنا ظالم ہے! پہلے ایک لڑکی کو جنت کی حوروں سے بھی بڑھ کر خوبصورت بناتا ہے اور پھر اسی لڑکی کو سر بازار بکوا کر ایک غریب بوڑھے کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ چلو یہاں تک تو ٹھیک ہے مگر پھر اسی لڑکی کے دل میں کسی اور لڑکے کی محبت ڈال کر تماشہ کیوں دیکھتا ہے؟'' میں دل ہی دل میں خدا سے شکوہ کرتے کرتے سیٹ کی پشت سے سر لگا کر سو گیا۔

اچانک ٹائروں کے چرچرانے کی آواز آئی اور بس ایک زوردار بریک لگا کر رک گئی۔ میرا سر اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرایا۔ ایمان نیچے گرنے لگی تھی لیکن میں نے اسے بروقت پکڑ کر گرنے سے بچا لیا۔

''راضی! کیا ہوا؟'' ایمان ابھی صرف اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ باہر فضا گولیوں کی تھرتھراہٹ سے گونج اٹھی۔

''اے ڈرائیور! بس کو بریک کیوں لگائی ہے، بس کیوں روکی؟'' مسافر اونچی اونچی آواز میں ڈرائیور کو گالیاں دینے لگے۔

''چپ! سب لوگ اپنی اپنی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھ جاؤ! اگر کسی نے کوئی بھی غلط حرکت کی تو ہم اسے گولی سے اڑا کر رکھ دیں گے۔'' پانچ چھ ڈاکو بس کا دروازہ کھول کر اندر گھس آئے۔

انہوں نے بس کے ڈرائیور اور دونوں کنڈیکٹروں کو بس سے نیچے اتار لیا۔ میں نے شیشے سے باہر دیکھا تو چار ڈاکو نیچے سڑک پر ہی کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں جدید مشین گنیں پکڑی ہوئی تھیں اور کندھے پر فل میگزینوں سے بھرا ہوا ایک ایک بیگ تھا۔

ہماری بس پنجاب اور سندھ کے بارڈر پر موجود ''کچے'' کے علاقے میں کھڑی تھی۔ سندھ اور پنجاب کے

بارڈر پر کچے کا علاقہ پاکستان کے چند خطرناک ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہاں قانون کی کوئی عمل داری نہیں ہے۔ دریائے سندھ کا کنارہ اور گھنے جنگلات ڈاکوؤں کے لیے محفوظ پناہ گاہ کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکو مشین گن اور اسلحے سے لیس ہو کر گھوڑوں پر بیٹھتے اور آن کی آن میں کسی بھی اکیلی بس کو روک کر تمام لوگوں کی تلاشی لیتے، عورتوں اور مردوں سے زیورات اور نقد رقم چھین کر منٹوں میں جنگل میں غائب ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ جنگل کے چپّے چپّے سے واقف ہوتے تھے اس لیے پولیس بھی ان کے پیچھے جنگل میں جانے سے گھبراتی تھی۔ یہ وہی سندھ کے روایتی ڈاکو تھے۔

بس ڈرائیور نے بس کو ان سے بچا کر نکال لے جانا چاہا تھا مگر انہوں نے فائر مار کر بس کا ایک ٹائر پھاڑ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ڈرائیور نے بریک لگائی اور بس الٹنے سے بچا لی۔

بس میں چڑھتے ہی ان ڈاکوؤں نے تین چار لوگوں کو گن کے بٹ اور تھپڑ وغیرہ مارے تو سب لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر دبک کر بیٹھ گئے۔ جب سارے مسافر اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تو ان میں سے ایک ایک ڈاکو بس کی اگلی اور پچھلی سائیڈ پر کھڑا ہو گیا اور باقی سب ایک ایک مسافر کی تلاشی لے کر اس کے پاس موجود تمام قیمتی اشیاء کو تھیلوں میں ڈالنے لگے۔

میرے اور ایمان کے پاس ٹوٹل دو ہزار سے اوپر روپے تھے۔ یہی ہماری کُل جمع پونجی تھی۔ ہم نے اپنی آنے والی زندگی کا آغاز انہی دو ہزار روپے سے شروع کرنا تھا لیکن ڈاکو وہ جمع پونجی لُوٹ کر لے جانے والے تھے۔

میں بے بسی سے دائیں بائیں دیکھنے لگا لیکن مجھے کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید کوئی بے وقوفی کرنے کی کوشش کرتا لیکن چونکہ ایمان میرے ساتھ تھی اور مجھے ایمان کی زندگی کی فکر تھی۔ پیسے تو آنے جانے والی چیز تھی۔ زندگی میں مشکلات تھوڑی اور بڑھ جاتیں لیکن میں محنت کرنے والا جٹ تھا، ایمان کو دو وقت کی روٹی کھلا سکتا تھا۔ اگر ایمان کو کچھ ہو جاتا تو پھر میں ساری زندگی اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔

''ہاں بچو! کتنے کتنے پیسے ہیں تمہارے پاس؟ چلو کھڑے ہو جاؤ اور ایک ایک کر کے تلاشی دو!'' ایک ڈاکو نے ہمارے کپڑوں والے لفافے لیے تھے اور ایک ایک کپڑے کو باریک بینی سے چیک کر رہا تھا۔

وہ مکمل طور پر پروفیشنل تھے۔ وہ سیٹوں کے نیچے اور ان کے پھٹے ہوئے کوّرز میں ہاتھ ڈال ڈال کر دیکھ رہے

تھے۔ یہ ان کا کام تھا اور وہ اپنے کام میں ماہر تھے۔

''ہاں! لڑکی کتنے پیسے ہیں تمہارے پاس؟'' ڈاکو ایمان کی تلاشی لینے کے لیے آگے بڑھا تو ایمان نے ۱۲۰۰ روپے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔

''بھیا! میرے پاس اتنے ہی پیسے ہیں۔'' ایمان نے چونکہ اس کو بھیّا بول دیا تھا اس لیے ڈاکو نے ایمان کی تلاشی لینے کا اردہ ملتوی کر دیا۔اس نے خاموشی سے ایمان کے ہاتھ سے پیسے لیے اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''تمہارے پاس کتنے ہیں؟'' ڈاکو مجھ سے مخاطب ہوا۔

''راضی! سارے پیسے دے دو بھیا کو! ہمیں خدا اور دے دے گا۔'' ایمان نے مجھے کہا تو میں نے ہوشیاری کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور خاموشی سے ساری رقم اس کے حوالے کر دی۔

اس سے پہلے کہ وہ تھیلے میں پیسے ڈالتا، کپڑوں والے لفافے کی تلاشی لینے والے ڈاکو کی نظر پیسوں پر پڑ گئی۔ پہلے ڈاکو کے پاس میری اور ایمان کی اکٹھی رقم تھی، وہ پچاس پچاس کے نوٹوں کی چھوٹی سی گڈی تھی۔

''کتنے پیسے نکلے ہیں ان کے پاس سے؟'' دوسرے ڈاکو نے گڈی کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

اسے پکڑتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ پیسے دو ہزار سے اوپر ہیں۔پہلی بار ان کے ہاتھ میں اتنی بڑی رقم لگی تھی وہ بھی دو نوجوانوں سے۔

''تمہارے ماں باپ کدھر ہیں؟'' دوسرے ڈاکو نے گڈی کو ہاتھ میں تولتے ہوئے کہا۔اس کی آنکھیں کسی ایکسرے مشین کی طرح ایمان کے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔

''وہ آگے بیٹھے ہیں۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''کدھر؟ کھڑے ہو جاؤ اور سیٹوں سے باہر نکلو! ان کے پاس سے دو ہزار سے اوپر رقم ملی ہے تو ان کے ماں باپ دیکھو! اگر بچوں کے پاس اتنی رقم ہے تو ان کے ماں باپ کے پاس لازمی بڑی رقم ہو گی جو انہوں نے کہیں چھپا دی ہے۔'' اس ڈاکو نے اگلے سرے پر کھڑے ڈاکو کو سردار بولتے ہوئے کہا تو وہ ڈاکو جلدی سے ہمارے پاس آ گیا۔

''ہاں بھائی! کدھر بیٹھے ہوئے ہیں تمہارے ماں باپ؟''

''ہمارے ماں باپ ادھر نہیں ہیں، ہم اکیلے ہی کراچی جا رہے ہیں۔'' اب کی بار ایمان نے سردار ڈاکو کو جواب دیا۔

''اچھا تو تم اکیلے ہی سفر کر رہے ہو اور میرے خیال میں تم بہن بھائی بھی نہیں ہو! کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟'' سردار نے ایمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تو ایمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں! اب میں سمجھ گیا۔۔۔۔تم دونوں گھر سے بھاگ کر کراچی جا رہے ہو۔ واہ! کیا بات ہے میرے عاشق کی! لڑکی کو گھر سے بھگا کر کراچی لے جا رہے ہو؟'' سردار نے میرے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''چچا پلیز! اسے مت مارو! آپ لوگوں نے پیسے لے لیے ہیں، اب آپ ہمیں جانے دو۔'' ایمان جلدی سے میرے آگے آ گئی۔ لیکن لفافے والے ڈاکو نے اسے بازو سے پکڑ کر کرسی پر گرا دیا۔

''کدھر شہزادی! بڑے عرصے بعد کوئی پریمی جوڑا ملا ہے۔ کیوں دوستو! آج کی رات جشن کرنے کا موڈ ہے؟'' اس ڈاکو نے انتہائی اوباش لہجے میں کہا تو سارے ڈاکو اونچی اونچی آواز میں شور مچانے لگے۔

''چلو بچے! تم تو اب تین چار دن ہماری مہمان نوازی میں گزارو، اس کے بعد ہم خود تمہیں کراچی چھوڑ آئیں گے۔'' سردار نے مجھے بازو سے پکڑا اور بس سے نیچے دھکا دے دیا۔

گھر سے بھاگنے والے جوڑوں کا کوئی آگے پیچھے نہیں ہوتا اس لیے یہ ڈاکو لوگ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے تھے، ہفتہ دس دن اس لڑکی کو استعمال کرتے اور پھر دونوں کو جنگل سے باہر پھینک دیتے تھے۔ چونکہ وہ دونوں گھر سے بھاگے ہوئے ہوتے تھے اس لیے وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتے تھے۔ شہر پہنچ کر لڑکا تو لڑکی کو چھوڑ کر بھاگ جاتا کیونکہ دس دن تک لڑکی کا ریپ ہوتا ہوا دیکھ کر چاہے جتنی بھی محبت ہو، لڑکا کبھی بھی دوبارہ اس لڑکی سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا اور اس کے بعد لڑکی شہر کی گلیوں میں ذلیل ہوتی ہوتی کسی کوٹھے کی زینت بن جاتی۔

حقیقت چاہے جتنی بھی کڑوی کیوں نہ ہو لیکن یہی حقیقت ہے اور میں حقیقت ہی لکھوں گا۔ یہ چیز ہم

راجستھانیوں کے خون میں ہے۔ راجستھانی صرف اس وقت تک ہی لڑکی سے محبت کے وعدے کرتے ہیں جب تک وہ لڑکی پاک دامن ہوتی ہے۔ جب وہی لڑکی کسی حادثے میں اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے تو ساری محبت پانی کی طرح بہہ جاتی ہے جسے ہم غیرت کا نام دیتے ہیں۔

بے شک ایمان میرے لیے ان سب چیزوں سے اوپر تھی۔ میں ایمان سے عشق کرتا تھا۔ مجھے ایمان کے جسم سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ایمان اپنے جسم کو میری امانت سمجھنے لگی تھی اور یہاں ان ڈاکوؤں سے اس امانت کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''چلو ڈرائیور! اب جلدی سے ٹائر تبدیل کرو اور نکل جاؤ ادھر سے، یہ دونوں پریمی اب ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔'' سردار ڈاکو نے ڈرائیور کو تھپڑ مارتے ہوئے کہا تو ڈرائیور جلدی جلدی ٹائر تبدیل کرنے لگا۔

''آہ! سالی دانت مارتی ہے۔'' ایمان نے اچانک اس ڈاکو کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے تو اس ڈاکو نے چیخ ماری اور ایک زوردار تھپڑ ایمان کے منہ پر مار دیا۔

ایمان چھوٹی سی تو تھی، ڈاکو کے ایک تھپڑ سے وہ دو فٹ دور جا کر گری۔ اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اب کی بار وہ سردار ڈاکو کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

''سردار چاچا! ہم دونوں کو جانے دو! ہم دونوں گھر سے بھاگا ہوا کوئی پریمی جوڑا نہیں ہیں، ہمیں جانے دو سردار چاچا!''

''چپ کر سالی! پریمی جوڑا نہیں ہو تو کیا بہن بھائی ہو؟ ایک رات ہمارے ساتھ گزارو گی تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ مرنے نہیں دیں گے تم کو اور تمہارے اس یار کو!'' تھپڑ مارنے والے ڈاکو نے ایمان کو بالوں سے پکڑا اور پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔

''سردار! ہمیں چھوڑ دو، تم ہمیں لے جا کر بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ اگر میری ایمان کو کچھ ہو گیا تو میں ایک ایک سے بدلہ لوں گا۔ گولی مار کر ہمیں مار دو، ورنہ اگر میں بچ گیا تو ایک ایک کو چن چن کر ماروں گا۔'' میں نے چیخ چیخ کر بولنا شروع کر دیا۔

مجھے تین ڈاکوؤں نے پکڑا ہوا تھا اس لیے میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ان میں سے ایک ڈاکو نے

میرے منہ پر ہاتھ رکھا اور مجھے خاموش کر دیا۔

ایمان نے ایک بار پھر اس ڈاکو کی کلائی منہ میں لی اور پوری قوت سے دبا دیا۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت میں ایمان کے پورے پورے دانت اس کی کلائی کے اندر گھس گئے۔

''آہ! سردار میں مر گیا۔'' اس ڈاکو نے ایمان کے بال چھوڑ کر اسے دھکا دے دیا تو وہ ایک جھٹکے سے زمین پر گر گئی۔

ایمان کے دانت اس کی کلائی میں پیوست ہو گئے تھے۔ ڈاکو کی کلائی کی نس کٹ چکی تھی اس لیے اس کی کلائی سے خون ایک فوارے کی طرح نکلنے لگا۔

''سردار چاچا! آپ غلط لوگوں کو لے جانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' ایمان دوبارہ اٹھ کر سردار کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا پورا چہرا خون سے سرخ ہو چکا تھا۔

سردار نے ایک نظر زمین پر تڑپتے ہوئے ڈاکو کو دیکھا اور ایمان کی طرف متوجہ ہوا۔ دوسرے ڈاکو نے جلدی سے اس ڈاکو کی کلائی کی نس کو باندھ دیا جس سے خون بہنا بند ہو گیا تھا۔

''سردار! اس کو چھوڑ نا مت، اس کتیا نے جتنا میرا خون نکالا ہے آج رات اتنا ہی خون میں اس کا نکالوں گا۔'' وہ ڈاکو ابھی بھی ایمان کو گالیاں دے رہا تھا لیکن اب کی بار وہ پاس آنے کی غلطی نہیں کر رہا تھا۔

''کہاں سے آئے ہو تم دونوں؟'' سردار نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ایمان سے پوچھا۔

''ہم بہاولپور سے آئے ہیں سردار چاچا!'' ایمان نے ابھی تک اس کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔

''لیکن تمہاری زبان تو راجستھانی نہیں ہے، تم تو اپر پنجاب کی زبان بول رہی ہو۔'' سردار ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

''مجھے گجرات سے خرید کر بہاولپور لایا گیا تھا، میں ۳۰ ہزار کی شادی شدہ بیوی ہوں سردار چاچا!'' ایمان نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا تم شادی شدہ ہو؟'' سردار ایمان کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

''ہاں چاچا! ۵۰ سال کا ایک بوڑھا ۳۰ ہزار میں خرید کر لایا تھا مجھے گجرات سے اور یہ مجھے بھگا کر نہیں بچا کر لایا ہے۔ ہمیں جانے دو سردار چاچا! مجھے نہیں معلوم کون سی مجبوری نے تمہیں ڈاکو بننے پر مجبور کیا ہے لیکن اگر تم میری کہانی سن لو تو تمہیں اپنی مجبوری بہت چھوٹی لگنے لگے گی۔ میں نے ۱۳ سال کی عمر میں دنیا کا ہر درد سہہ لیا ہے تو پھر آپ لوگوں کے دیئے ہوئے ظلم سے بھی گزر جاؤں گی چاچا!'' ایمان نے اپنے ہاتھ کھولے اور سردار کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ ایمان کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے اور وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

پتہ نہیں کون سی مجبوریوں نے ان لوگوں کو ڈاکو بنا دیا تھا لیکن تھے تو وہ آخر انسان ہی۔ ایمان کی باتوں نے ان ڈاکوؤں کے دل پگھلا کر رکھ دیئے تھے۔ ایمان کو زمین پر پڑے روتے ہوئے دیکھ کر وہ سب ساکت ہو گئے تھے۔ بس کا ڈرائیور بھی ٹائر تبدیل کرنا بھول گیا تھا۔ وہ بھی ایمان کی باتوں سے غمگین ہو گیا تھا۔

''چلو چاچا! کدھر جانا ہے؟ میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' روتے روتے ایمان کا دل ذرا سنبھلا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''چلو چاچا! آج کی رات آپ کو بھی پتہ چل جائے گا عورت جب محبت کرنے پر آتی ہے تو پھر کس حد تک جا سکتی ہے۔ آپ لوگ اپنے ظلم کی انتہا کر دینا اور ہم دونوں آپ کو اپنی محبت کی انتہا دکھائیں گے۔ چلو چاچا!'' ایمان نے سردار کا بازو پکڑا اور اسے گھوڑے کی طرف لے جانے لگی لیکن سردار نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہیں کی، وہ اپنی جگہ پر چٹان کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں تھیں۔

''راجو! ان دونوں سے جتنا پیسہ لوٹا ہے وہ ان کو واپس کر دو۔'' سردار نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں راجو سے کہا تو راجو نے جلدی سے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ہمارے دیئے ہوئے پیسے نکالے اور میرے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔

انہوں نے ہم دونوں سے قریباً دو ہزار روپے لوٹے تھے لیکن راجو مجھے دو ہزار سے کہیں زیادہ پیسے دے رہا تھا۔ اس وقت تو میں نے دھیان نہیں دیا لیکن بعد میں جب میں نے پیسے گنے تو وہ تین ہزار کے قریب تھے۔

''بیٹی! میں ایک ڈاکو ہوں۔ اس ملک کی پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میری وجہ سے تم دونوں کو جو تکلیف پہنچی ہے ہے میں اس کے لیے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ بیٹی! ہر کوئی اپنی

مرضی سے ڈاکو نہیں بنتا، ہر شخص کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں جو اس کو ڈاکو بننے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ میں بھی زمانے کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر ڈاکو بن گیا ہوں۔ پتہ نہیں کس دن کوئی اندھی گولی آئے گی اور میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میں تم سے معافی مانگتا ہوں، مجھے معاف کر دینا اور میرے لیے دعا کرنا! خدا محبت کرنے والوں کی دعائیں بہت نزدیک ہو کر سنتا ہے۔ شاید میں نے زندگی میں کوئی اچھا کام کیا تھا جو تم دونوں پر ظلم کرنے سے بچ گیا ورنہ اگر میں تمہارے ساتھ کچھ کر گزرتا اور مجھے بعد میں یہ سب کچھ پتہ چلتا تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ خدا نے مجھے تم محبت کرنے والوں کے درمیان میں آنے سے بچا لیا ہے۔ مجھے معاف کر دینا!''

''چلو راجو! پولیس آنے والی ہوگی۔'' وہ سب گھوڑوں پر سوار ہوئے اور جنگل میں غائب ہو گئے۔

ڈرائیور جلدی سے ٹائر تبدیل کرنے لگا۔ ڈرائیور نے ابھی ٹائر تبدیل کیا ہی تھا جب پولیس کی چار بڑی گاڑیاں سائرن بجاتی ہمارے سر پر پہنچ گئیں۔ پولیس کو شاید پتہ چل گیا تھا کہ ڈاکو چلے گئے ہیں۔ ہمارے ملک کی پولیس اکثر ڈکیتی یا کسی بھی قسم کی واردات کے بعد ہی پہنچتی ہے۔

''ہاں بھئی! ڈاکو کدھر کو گئے ہیں؟ کتنے ڈاکو تھے؟'' وہ سب پولیس کی گاڑیاں ہمارے پاس آ کر رکیں۔

پولیس کی گاڑیوں میں سے ایک گاڑی سے انسپکٹر رینک کا موٹا سا آدمی اترا اور مسافروں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ ایک بوڑھی عورت نے جنگل کی طرف انگلی کے اشارے سے بتایا کہ ڈاکو ادھر کو گئے ہیں۔ اس انسپکٹر نے جلدی سے کچھ آرڈر دیا اور پولیس کی تین گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئیں اس راستے کی طرف جانے لگیں۔ جس گاڑی سے وہ انسپکٹر اترا تھا صرف وہ گاڑی وہیں کھڑی رہی۔

''چلو بھئی! سارے بس میں سوار ہو جاؤ، اور تم بس کو میری گاڑی کے پیچھے پیچھے تھانے لے کر آؤ۔'' انسپکٹر نے ڈرائیور کو کہا۔

''وہاں پر ہم آپ سب لوگوں کے کوائف، چھینی گئی رقم اور دوسری چیزوں کی تفصیل لکھیں گے۔ اس کے بعد تم لوگ کراچی جا سکتے ہو۔''

''جی صاحب جی! میں آپ کے پیچھے پیچھے تھانے آ جاتا ہوں۔ وہ ڈاکو ہمارا سب کچھ ہی لوٹ کر لے گئے ہیں۔'' ڈرائیور نے بے بسی سے انسپکٹر کو بتایا لیکن اس انسپکٹر نے اس کی بات شاید سنی ہی نہیں۔ وہ واپس مڑا اور جا کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اگلے ہی لمحے انہوں نے گاڑی سٹارٹ کی اور تھانے کی طرف جانے لگے۔ ہمارے بس ڈرائیور نے بھی اس گاڑی کے پیچھے پیچھے بس چلانا شروع کر دی۔ دونوں گاڑیاں مین روڈ سے ہٹ کر ایک چھوٹی سڑک پر تھانے کی طرف جا رہی تھیں۔ میں اور ایمان اپنی اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھ چکے تھے۔ میں نے اپنی جیب میں موجود پیسوں کو نکالا اور گننا شروع کر دیا۔

''اوہ! یہ تو ۳ ہزار سے زیادہ۔۔۔'' مجھے حیران دیکھ کر ایمان بھی میری طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا راضی! کوئی مسئلہ ہے؟'' ایمان پہلے والے شاک سے باہر نکل چکی تھی۔

''ایمان! یہ تو تین ہزار سے زیادہ ہیں۔ پولیس نے پوچھا تو مسئلہ بن جائے گا۔'' میرے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

''ایمان! تم ایسا کرو یہ دو ہزار روپے اپنے پاس چھپا لو۔ پولیس کو ہم صرف ایک ہزار روپے کا ہی بتائیں گے۔'' میں نے دو ہزار روپے ایمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن راضی! پولیس والوں سے ہمیں کیا مسئلہ ہوگا؟'' ایمان نے میرے ہاتھ سے پیسے پکڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھو ایمان! یہ پولیس والے سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ڈاکوؤں کی طرح دل نہیں ہوتا، یہ ہیڈ کوارٹر کے احکامات کے تابع ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر تین ہزار روپے نکلتے ہیں تو ہمارے لیے جواب دینا بہت مشکل ہو جائے گا کہ اتنی بڑی رقم ہمارے پاس کہاں سے آئی ہے۔ وہ ہم پر چوری کا الزام بھی لگا سکتے ہیں۔ ہماری منزل کہیں ان پیسوں کی وجہ سے زیادہ دور نہ ہو جائے۔'' میں نے ایمان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ رقم ہمارے لیے مسئلہ پیدا کر رہی ہے تو میں اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیتی ہوں۔'' ایمان کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی طرف کا کھڑکی کا شیشہ کھول لیا۔

''نہیں! تم ان پیسوں کو پھینکو مت بلکہ کہیں چھپا لو۔ مجھے معلوم ہے وہ ہماری تلاشی نہیں لیں گے۔ یہ پیسے بعد میں ہمارے کام آئیں گے۔ کراچی جا کر پتہ نہیں کب مجھے کام ملے، تب تک یہی پیسے ہمارے کام آئیں گے۔ بس دعا کرو! خدا نے اگر ڈاکوؤں سے ہمیں بچا لیا ہے تو یہاں سے بھی ہمیں نکال دے گا اور ہم خیریت سے کراچی چلے جائیں گے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے ایمان سے کہا تو اس نے میری بات مان لی اور کھڑکی کا شیشہ بند کر کے پیسوں کو اپنے کپڑوں میں چھپانے لگی۔

تھوڑی دیر میں بس تھانے کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ ایک قلعہ نما عمارت تھی جس کی اونچی اونچی دیواروں پر ننگی خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں۔ رات کو وہ لوگ ان میں کرنٹ چھوڑ دیتے تھے۔ اندر صحن میں ایک طرف قیدیوں کو رکھنے کے لیے ایک سیل اور اس کے ساتھ ہی مردوں اور عورتوں کا الگ الگ غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ البتہ سیل ایک ہی تھا۔ چونکہ یہاں پر قیدیوں کو زیادہ سے زیادہ ایک یا دو راتیں ہی رکھا جاتا تھا اور پھر ان کو شہر کی بڑی جیل میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔

ویسے بھی پاکستان میں عورتوں کے جرم کرنے کی شرح مردوں کے مقابلے میں صفر سے بھی نیچے تھی۔ اس لیے اس تھانے میں دو دو سیل بنانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہو گی۔ قیدیوں کے سیل کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھانہ انچارج کا دفتر تھا۔ اس کے علاوہ چار مزید کمرے تھے جو دیگر سٹاف کے دفتری امور کے لیے مخصوص تھے۔ بس تھانے کی حدود کے اندر داخل ہو گئی تو بس ڈرائیور اور دونوں کنڈیکٹر نیچے اتر گئے جبکہ باقی مسافر بس کے اندر ہی بیٹھے رہے۔

''ہاں شیرے! بس کے اندر چڑھ جاؤ اور پہلی سیٹ سے شروع کر دو، ایک ایک کر کے مسافروں کو میرے دفتر بھیجتے رہو اور جو فیملی اکٹھی سفر کر رہی ہو ان کو اکٹھے ہی میرے دفتر بھیج دو۔ چلو شاباش!''

''رفیق! تم دفتر میں بیٹھ کر ان کے کوائف لکھنے شروع کر دو!'' اس موٹے انسپکٹر نے پہلے کانسٹیبل بشیر اور پھر ہیڈ محرر رفیق سے کہا اور اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

''سب مسافر اپنے اپنے شناختی کارڈ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیں۔ ایک ایک کر کے میں سب کو نیچے دفتر بھیجوں گا، آپ لوگ اپنے گھر کا ایڈریس لکھوا دیں اور جتنی رقم لوٹی گئی ہے وہ بھی لکھوا دیں۔ اگر ڈاکو پکڑے گئے تو ہم آپ کا سامان اور پیسے آپ کے شہر پہنچا دیں گے۔ جو بچے یا عورتیں اپنے ماں باپ یا خاوند کے ساتھ سفر کر رہے ہیں وہ اکٹھے

ہی نیچے چلے جائیں اور ایڈریس لکھوا دیں۔'' کانسٹیبل بشیر نے بس کے اندر آ کر اونچی آواز میں اعلان کرتے ہوئے کہا اور پھر ایک ایک کر کے لوگوں کو نیچے بھیجنے لگا۔

''ہاں بچو! اٹھو! تمہارے والدین کدھر ہیں؟ ان کو ساتھ لے کر نیچے چلے جاؤ!''

میری عمر اس وقت تقریباً ۱۵ سال اور ایمان کی عمر ۱۳ سال تھی۔ پاکستان میں شناختی کارڈ ۱۸ سال کی عمر میں بنتا ہے۔ میں ابھی ۳ سال چھوٹا تھا اور ایمان تو بالکل ہی چھوٹی سی بچی لگتی تھی۔ وہ کانسٹیبل ہم دونوں کو بہن بھائی سمجھا تھا۔

''ہم اکیلے ہی سفر کر رہے ہیں۔ کراچی میں ہمارے ماموں کی شادی ہے، ابو نے ہمیں بہاولپور سے بس میں سوار کروا دیا تھا اور ماموں ہم کو کراچی سے رسیو کر لیں گے۔'' ہم بس سے نیچے اتر چکے تھے اور اب ہیڈ محرر کے سامنے کھڑے اپنا بیان دے رہے تھے۔

''کیا تم بہاولپور سے کراچی اکیلے ہی سفر کر رہے ہو؟'' محرر کی بجائے انسپکٹر ہم سے پوچھنے لگا۔

''جی سر! ہم پہلے بھی دوبارا کیلے ہی ماموں کے پاس جا چکے ہیں، وہ سٹیشن کے پاس ہی رہتے ہیں۔''

ایمان میرے بازو میں بازو ڈالے خاموش کھڑی تھی جبکہ میں مسلسل جھوٹ بول رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا اگر میں نے ایک سیکنڈ کا بھی وقفہ لیا تو ان کو شک پڑ جائے گا اور میں یہ سب کچھ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے! تم اپنے گھر کا ایڈریس لکھوا دو اور کتنے پیسے چھینے گئے ہیں وہ بھی لکھوا دو۔'' انسپکٹر نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

''جی! ہمارے کوئی پیسے نہیں چھینے گئے اور ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ ہمارا بہاولپور کا پتہ لکھنا چاہتے ہیں تو لکھ سکتے ہیں۔'' میں نے اپنی بات مکمل کی اور محرر کی طرف دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے! تم اپنے گھر کا پتہ لکھوا دو۔ ویسے اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن پھر بھی اچھا ہوتا ہے، تم لکھوا دو!'' انسپکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کام کو اب جلد از جلد ختم کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اسے بہاولپور کے ایک دور دراز کے گاؤں کا پتہ لکھوا دیا۔ میں ان کو اپنے گاؤں کا نام نہیں بتانا چاہتا

تھا۔

''ٹھیک ہے! اب آپ دونوں ادھر جا کر بیٹھ جاؤ، سب اپنا نام پتہ لکھوا دیں تو آپ کو کراچی روانہ کر دیں گے۔'' محرر نے ہمارا پتہ لکھ کر ہمیں ایک کونے کی طرف جا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہاں باقی سارے مسافر بھی اپنے کوائف لکھوا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اور ایمان بھی وہیں جا کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئے۔

''راضی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں سب کچھ ٹھیک ہونے کے باوجود بھی کہیں کچھ غلط ہونے والا ہے۔'' ایمان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں ہے، حوصلہ رکھو ایمان! بس تھوڑی دیر اور انتظار کر لو! اس کے بعد ہم کراچی کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہماری مدد کرے گا۔'' میں نے ایمان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''راضی! خدا ہمارے ساتھ نہیں ہے بلکہ خدا میرے ساتھ نہیں ہے۔ اگر وہ میرے ساتھ ہوتا تو مجھے ۳۰ ہزار میں اس بوڑھے کی جھولی میں نہ ڈالتا، میرے باپ کو ہیروئن کا عادی نہ بناتا اور میرا بچپن مجھ سے نہ چھینتا۔ نہیں راضی! خدا میرے ساتھ نہیں ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے اور اس کی نگاہیں زمین کی طرف جھک گئیں۔

اچانک تھانے کا بیرونی گیٹ کھلا اور اس میں سے ایک سرکاری جھنڈے والی پولیس جیپ اندر داخل ہوئی۔ انسپکٹر جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی ٹوپی پہنی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ پولیس جیپ سے ایک خوبصورت نوجوان ایس پی باہر نکلا۔ کلف زدہ اکڑی ہوئی وردی اور انتہائی سمارٹ ورزشی جسم، وہ کسی امیر باپ کی اولاد لگتا تھا جو شاید ڈائریکٹ مقابلے کا امتحان پاس کر کے پولیس میں ایس پی بھرتی ہوا تھا۔

پورا تھانہ یکدم الرٹ ہو گیا۔ بوٹوں کی ایک زوردار آواز آئی اور انسپکٹر کے ساتھ ساتھ سارے پولیس والوں نے اسے سلیوٹ کیا۔

''انسپکٹر صاحب! کیا ہوا؟ ڈاکوؤں کا کچھ پتہ چلا ہے؟'' وہ انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔

''نہیں سر! ابھی تک کوئی پتہ نہیں چلا۔ ان لوگوں کے گھروں کا ایڈریس لکھ رہے ہیں، اگر ڈاکو پکڑے گئے اور اُن سے مال برآمد ہوا تو اِن لوگوں کو مطلع کر دیں گے۔

''ٹھیک ہے اور کچھ؟ سب ٹھیک ہے؟'' وہ سیدھا ہمارے پاس آکر رک گیا۔

''آپ لوگ پریشان مت ہوں۔ ہم کوشش کریں گے، اگر کوئی پیش رفت ہوئی تو آپ کو مطلع کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے نا؟'' وہ ہم سے مخاطب ہوا تو ساتھ والے مسافروں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بیٹا! تم کہاں سے آئی ہو اور تمہارے کتنے پیسے چھینے گئے ہیں۔'' ایس پی ایمان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تو میں اور ایمان بھی جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''سر! یہ بہاولپور سے کراچی جا رہے ہیں۔ یہ بچ گئے ہیں، ان سے کوئی پیسے چوری نہیں ہوئے۔'' انسپکٹر نے ہمارے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''چلو شکر ہے! تمہارا نقصان ہونے سے بچ گیا۔ تمہارے ماں باپ کہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟'' اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر بیٹھے ہوئے مسافروں پر ڈالی۔

''سر! یہ اکیلے سفر کر رہے ہیں۔ ان کے ماموں کی شادی ہے کراچی میں۔'' اب کی بار بھی جلدی سے انسپکٹر نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔

''اچھا! کدھر سے آئے ہو؟'' ایس پی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سر! ہم بہاولپور سے آئے ہیں، کراچی میں ہمارے ماموں کی شادی ہے۔ وہ اڈے کے ساتھ ہی رہتے ہیں، ہم پیدل ہی وہاں سے ان کے گھر چلے جاتے ہیں۔'' میں نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔

''کیا تم بہن بھائی ہو؟'' اس نے مجھ پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

''سر آپ پنجاب سے ہو یا سندھ سے؟'' ایمان جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ بات کو بدلنے کی کوشش کرنے لگی اور وہ کامیاب بھی ہو گئی۔ ایس پی اپنے سوال کو بھول کر اب ایمان کی

طرف متوجہ ہوگیا۔

''تمہارے ماں باپ نے تم کو کیسے اکیلے کراچی بھیج دیا؟ اگر خدانخواستہ تمہارے ساتھ کوئی حادثہ ہو جاتا تو پھر ؟ کتنے لاپرواہ ماں باپ ہیں تمہارے!''

''نہیں سر! ہم پہلے بھی کئی بار سفر کر چکے ہیں، ہمیں کوئی پرابلم نہیں ہوتی۔'' میں ایس پی کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''کتنے پیسے چھینے ہیں تمہارے ان ڈاکوؤں نے؟'' ایس پی سوال پہ سوال کر رہا تھا۔

''نہیں سر! ان کے کوئی پیسے نہیں چھینے گئے، آپ کوئی چائے پانی وغیرہ لیں گے سر؟'' انسپکٹر نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے میری بہن! اپنا خیال رکھنا! بالکل تمہارے جتنی میری بھی چھوٹی بہن ہے۔'' ایس پی نے ایمان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ڈرائیور کدھر ہے؟ اسے لے کر آؤ! میں اس سے تمام ڈاکے کی تفصیل پوچھنا چاہتا ہوں۔'' ایس پی انسپکٹر کے دفتر کے باہر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک کانسٹیبل نے ایک ٹیبل لا کر اس کی کرسی کے آگے رکھ دیا تھا اور اس پر سفید کپڑا بچھا کر اسے ایک چھوٹا سا آفس بنا دیا تھا۔

ڈرائیور بیان دینے آیا تو ایس پی نے اسے اپنے سامنے رکھی کرسی پر بٹھایا اور اس کا بیان سننے لگا۔ میں اور ایمان دوبارہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ایمان میرے کندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔ میں ایمان کو تسلی دینے لگا۔ اب کی بار میری بھی چھٹی حس مجھے آنے والے خطرے سے خبردار کر رہی تھی کیونکہ ایس پی ڈرائیور کی باتیں سن کر بار بار ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''ایمان! وہ ایس پی کو ہمارے بارے میں تفصیل بتا رہا ہے، پتہ نہیں یہ ایس پی اب کیا فیصلہ کرتا ہے۔'' میں ایمان کو بتانے لگا تو وہ بھی اب ایس پی کی طرف رحم دلانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میں دل ہی دل میں خیریت کی دعائیں مانگنے لگا۔ ایس پی اور ڈرائیور کی باتیں ختم ہوئیں تو ایس پی نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا اور وہ کانسٹیبل ہماری طرف آنے لگا۔

''آپ دونوں کو ایس پی صاحب نے بلایا ہے!'' کانسٹیبل ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''چلو ایمان!'' میں نے ایمان کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھڑا ہونے میں مدد دی۔ ہم دونوں ایس پی صاحب کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

''اچھا تو تم بہن بھائی نہیں ہو!'' ایس پی کچھ دیر ہمیں گھورتا رہا۔ اس کے بعد اس نے بولنا شروع کر دیا۔

''گھر سے بھاگ کر کراچی جا رہے ہو! کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟'' ایس پی نے ہم سے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سوری! میں نے تم کو اپنی بہن بول دیا تھا لیکن تم لوگ اس قابل نہیں ہو جو تم سے کوئی لفظوں کا بھی رشتہ رکھے۔ انسپکٹر صاحب! ان دونوں کو اپنی گاڑی میں بٹھاؤ اور خود ان کے گاؤں چھوڑ کر آؤ!'' ایس پی اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور انسپکٹر سے کہنے لگا۔

''پتہ نہیں آج کل کے زمانے کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنی عمر دیکھی ہے؟ ابھی ٹھیک طرح سے منہ دھونا بھی نہیں آتا ہو گا تم کو اور اس بے غیرت کی باتوں میں آ کر گھر سے بھاگ رہی ہو!''

''سر جی! آپ ہم دونوں کو غلط۔۔۔''

وہ ایمان سے مخاطب تھا جب کہ میں اسے اپنے بارے میں بتانے ہی لگا تھا۔ اس نے میری پوری بات بھی نہیں سنی اور ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مار دیا۔ میں اس کے تھپڑ سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن زمین پر گرنے سے بچ گیا تھا۔

''صفائی مت دو بے غیرت انسان! اپنے چار دن کے مزے کے لیے تُو اس بے چاری لڑکی کی زندگی تباہ کرنے لگا تھا۔'' ایس پی باہر جانے کے لیے آگے بڑھا لیکن ایمان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

''بھیّا پلیز! ہم بہاولپور نہیں جانا چاہتے، آپ ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے!'' ایمان نے اس سے

درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں! سب کچھ جانتا ہوں۔تم شادی شدہ ہو، ۳۰ ہزار میں خریدی گئی ہو، یہ تمہاری جان بچا کر بھاگ رہا ہےاورتم نے اس ڈاکو کی کلائی کو چبا ڈالا تھا۔بس یا کچھ اور؟''

''میڈم! یہ جو تم میری وردی پر اتنے سارے سٹار دیکھ رہی ہو نا! یہ میں نے بازار سے خرید کر نہیں لگائے ہیں بلکہ میں نے اپنی محنت سے حاصل کئے ہیں۔ میرے ماتھے پر بے وقوف نہیں لکھا ہوا ہے اور نہ ہی میں ان ڈاکوؤں کی طرح اجڑ اور گنوار ہوں جو تمہاری اس من گھڑت کہانی پر یقین کر کے بیٹھ جاؤں گا۔ بھیا بولتی ہے مجھے؟ ہونہہ! تمہارے جیسی میری چھوٹی بہن ہوتی تو میں اس کا گلا دبا دیتا۔'' اس نے اپنا ہاتھ ایمان کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور اپنی گاڑی کی طرف جانے لگا۔

''ایک بار بہن بول دیا ہے تو گلا بھی دبا کر دیکھ لو!''

ڈرائیور اس کے لیے جیپ کا دروازہ کھول چکا تھا جب ایمان نے اونچی آواز میں کہا۔ وہ جیپ کا دروازہ بند کر کے ہمارے پاس آ گیا اور ایمان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ایک بار بہن تو آپ نے بول دیا ہے، اب گلا بھی دبا کر دیکھ لو!'' ایمان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کا ڈر بالکل ختم ہو گیا تھا اور وہ کسی شیرنی کی طرح ایس پی کے سامنے تن کر کھڑی تھی۔ اگلے چند لمحوں تک وہ ایس پی ایسے ہی ایمان کو گھورتا رہا۔

''انسپکٹر صاحب! ان دونوں کو ابھی کے ابھی گاڑی میں بٹھاؤ اور ان کے گاؤں کے نمبردار کے حوالے کر کے آنا! مجھے اس نمبردار کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی اور ان دونوں کی وصولی کی رسید اس کے انگوٹھے کے نشان کے ساتھ چاہیے۔ اس نمبردار کو کہہ دینا کہ اس لڑکی کو میں نے ایک بار بہن بولا ہے، اگر مجھے پتہ چل گیا کہ کسی نے ان دونوں کو ہاتھ بھی لگایا ہے تو میں پورے گاؤں کو پکڑ کر اندر تھانے میں بند کر دوں گا۔ اب جاؤ!'' اس نے انسپکٹر سے کہا تو انسپکٹر جلدی سے گاڑی تیار کرنے کا کہنے لگا۔

''ایمان! مجھے نہیں معلوم کہ میں غلط کر رہا ہوں یا صحیح۔ ہاں! جو چیز مجھے صحیح لگ رہی ہے میں وہی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کراچی بہت بڑا شہر ہے اور تم دونوں ابھی بچے ہو۔ کراچی شہر تم دونوں کو کھا جائے گا۔ اپنے گاؤں میں بے شک تم دونوں ایک دوسرے سے الگ رہو گے لیکن زندہ تو رہو گے! ابھی تمہاری عمر گھر سے بھاگنے کی نہیں ہے۔ میرا نام ایس پی عرفان احمد ہے۔ اگر کل کو تمہیں کسی بھی قسم کی کوئی پرابلم ہوئی تو سندھ کے اس تھانے میں آ کر میرا نام لینا میں ضرور تمہاری مدد کروں گا۔'' وہ ایمان کو سمجھانے لگا۔ تب تک انسپکٹر نے گاڑی تیار کر لی تھی۔

''سر! ہم جانے لیے تیار ہیں۔'' انسپکٹر نے آ کر ایس پی کو سلیوٹ کیا۔ ہم دونوں پولیس جیپ میں جا کر بیٹھ گئے۔

''ایمان! اپنی طرف سے تو میں صحیح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اگر مجھ سے کہیں غلطی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا!''

سندھ پولیس کا ایک اعلیٰ رینک کا پولیس آفیسر جس کی ماہانہ تنخواہ بھی ۳۰ ہزار سے زیادہ ہو گی وہ اس ایمان سے معافی مانگ رہا تھا جس کی زندگی کی قیمت اس کے باپ نے ۳۰ ہزار لگائی تھی۔ ۳۰ ہزار میں بکی ہوئی غلام عورت سے سندھ پولیس کا ایس پی معافی مانگ رہا تھا۔

''واہ رے خدا! تیری حکمتوں کو سمجھنا شاید کسی انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔'' میں دل ہی دل میں سوچنے لگا اور ہماری گاڑی بہاولپور کے ریگستانوں کی طرف بڑھنے لگی۔

''راضی! اب کیا ہو گا؟ گاؤں والے تو ہم دونوں کو دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔'' ایمان رونے لگی اور روتے روتے میرے گلے لگ گئی۔

''انسپکٹر صاحب! پلیز کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں؟'' میں نے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں راضی صاحب! میں گورنمنٹ آف پاکستان کا ایک غریب سا ملازم ہوں، میرے اپنے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمیں صرف آرڈر کو پورا کرنا ہی سکھایا جاتا ہے۔ اگر ایس پی صاحب نے آپ کو گاؤں چھوڑ کر آنے کا کہا ہے تو میں آپ کو گاؤں ہی چھوڑ کر آ سکتا ہوں۔ مجھے نمبردار سے وصولی کی رسید لینے کا بھی اسی لیے کہا گیا ہے تاکہ میں کوئی چالاکی نہ کر سکوں۔'' انسپکٹر نے پیچھے منہ کر کے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ جیپ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ ہم دونوں باقی سپاہیوں کے ساتھ پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے اسے ہم سے بات کرنے کے لیے پیچھے منہ کرنا پڑتا تھا۔

''آپ لوگ ایک مہربانی کرو! اپنے گھر کا صحیح پتہ بتا دو تاکہ ہم لوگوں کو زیادہ پریشانی نہ ہو۔'' انسپکٹر نے اس بار قدرے دھیمے لہجے میں کہا تو میں نے اسے اپنے گاؤں کا صحیح نام بتا دیا۔

ایک گھنٹے تک ہم بہاولپور شہر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ڈرائیور نے گاڑی ہمارے گاؤں جانے والی سڑک پر ڈال دی اور ہم گاؤں کی طرف روانہ ہونے لگے۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے ریت کے ٹیلے چل رہے تھے۔ گرم ہوا کے زور سے ریت اڑ اڑ کر سڑک پر آ جاتی تھی لیکن کوئی گاڑی تیز رفتاری سے آتی تو ریت دوبارہ سڑک سے نیچے اتر جاتی۔ ریت کی سڑک کے ساتھ یہ آنکھ مچولی چلتی رہتی تھی۔

اگر کبھی کسی طوفان سے سڑک ریت سے بلاک ہو جاتی تو گورنمنٹ کا ایک ٹرالر آ کر اسے واپس باہر پھینک دیتا اور سڑک دوبارہ کھل جاتی تھی۔ بعض گاڑیاں ان ریت کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں کے اوپر سے ہی گزر جاتی تھیں۔ ہماری گاڑی ریت سے اٹی ہوئی اس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

''ایمان! گاؤں آ گیا۔'' میں نے ایمان کو بازو سے پکڑ کر ہلایا تو وہ سوچوں کی دنیا سے باہر آ گئی۔

ہم گاؤں کے اندر داخل ہو کر نمبردار کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ پولیس کی گاڑی دیکھ کر گاؤں کے لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔

''نمبردار کدھر ہے؟ اسے بلا کر لاؤ!'' انسپکٹر نے ایک آدمی سے کڑک دار آواز میں کہا تو وہ جلدی سے گھر کے اندر نمبردار کو بلانے چلا گیا۔

''تم دونوں نیچے آ جاؤ اور گھبراؤ مت! میں نمبردار کو سمجھا کر جاؤں گا، وہ تم دونوں کو کچھ بھی نہیں کہے گا۔'' انسپکٹر نے ہم دونوں کو نیچے اترنے کا کہا۔

میں ایمان کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ میں نے نیچے اتر کر چاروں طرف نظر دوڑائی، تقریباً پورا گاؤں ہی اکٹھا ہو گیا تھا۔ چھوٹا سا تو گاؤں تھا، خبر کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

''راضی!'' ایمان نے خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

میں نے اپنے ہاتھ پر ایمان کے ہاتھوں کی سختی محسوس کی تو بے چارگی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھے کہیں بھی اپنے ابو اور بھائی نظر نہیں آئے، شاید وہ ڈیرے پر کام کر رہے ہوں گے۔

اچانک بھیڑ میں مجھے وحید کا چہرہ نظر آیا، وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ میرے چہرے پر پھیلی ہوئی بے چارگی اسے شاید سب کچھ سمجھا گئی تھی۔ اس لیے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تسلی دی اور پھر بھیڑ سے باہر نکل گیا۔ وہ میرے باپ کو اطلاع دینے کے لیے سرپٹ بھاگ رہا تھا۔

''جی انسپکٹر صاحب! ہمارے گاؤں کے بچوں کو کدھر سے پکڑ کر لے آئے ہو!'' نمبردار نے گھر سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

اس کی نظر ہم دونوں پر پڑ گئی تھی اور وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میں نے اس گاؤں کی لڑکی کو گھر سے بھگا کر بہت بڑا جرم کر دیا تھا، جس کی سزا بھی بہت بڑی تھی۔

''بیٹا! تجھے نوراں باجی یاد ہے نا!'' مجھے آج سے دو مہینے پہلے اپنے ابو کی کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔

''جی ابو جی!''

مجھے نوراں باجی بہت اچھی لگتی تھی۔ جب میں سیالکوٹ میں رہتا تھا، وہاں ہمارے محلے میں نوراں باجی بھی رہتی تھی۔ میں جب بھی ان کے گھر کے سامنے سے گزرتا تھا تو وہ مجھے پکڑ لیتی اور بہت اچھی اچھی چیزیں پکا کر کھلاتی تھی۔ اس کی دوسرے گاؤں کے ایک لڑکے سے دوستی تھی اور میں ان دونوں کے خط ایک دوسرے کو دیا کرتا تھا۔

''جی ابو! مجھے یاد ہے۔'' میں نے ابو سے کہا تو وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

''وہ مر گئی ہے! پتہ ہے راضی؟''

''وہ کیسے مری ہے؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''وہ ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی اور اس لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی، لیکن پھر پکڑی گئی۔ پتہ ہے پھر کیا ہوا؟ اس کا بھائی اسے زمین پر گرا کر اس کے پیٹ پر بیٹھ گیا اور اس کا گلا دبا ڈالا۔ پورا گھر نوراں کو تڑپتے ہوئے

دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی سگی ماں اسے تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہوئے دیکھتی رہی لیکن چپ رہی۔ یہ دنیا بہت ظالم ہے، جب غیرت کی بات آتی ہے تو پھر ماں اپنی سگی بیٹی کو بھی مار دیتی ہے تو پھر تمہاری یہ چھوٹی موٹی محبتیں کیا چیز ہیں؟ راضی! تم غلط جگہ پر غلط لڑکی سے محبت کر بیٹھے ہو۔''

''نمبردار صاحب! یہ بچے ہیں اس لیے غلطی کر بیٹھے ہیں، مجھے امید ہے آپ ان کو معاف کر دو گے۔'' انسپکٹر نے نمبر دار کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''جی سر جی! آپ نے ہمارے گاؤں کے بچے ہمیں پہنچا دیئے ہیں اب آپ کا بہت بہت شکریہ، اگلا ہمارا کام ہے۔ ہم ان کو چھوڑ دیں گے آپ فکر مت کرو! کوئی چائے پانی وغیرہ پینا ہے تو حاضر ہوں!'' نمبرار نے رعونت سے کہا تو انسپکٹر کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''دیکھو نمبر دار صاحب! ہم ان بچوں سے وعدہ کر کے لائے ہیں کہ آپ لوگ ان کو کچھ بھی نہیں کہو گے۔ ہمارے ایس پی صاحب نے ایمان کو اپنی بہن بولا ہوا ہے۔ اس لیے اگر آپ لوگوں نے ایمان یا پھر اس دوسرے لڑکے کو کچھ بھی کہا تو ایس پی صاحب خود اس معاملے کو دیکھ لیں گے۔ یہ کوئی کمزور اور غریب بچے نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے ایس پی صاحب کا ہاتھ ہے۔ میں خود بھی کل چکر لگاؤں گا اور اگر مجھے پتہ چلا کہ آپ لوگوں نے ان دونوں کو مارا ہے تو میں سب کو پکڑ کر تھانے میں بند کر دوں گا۔ ایمان میری بیٹی کی طرح ہے۔''

انسپکٹر نے ایمان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو ایمان نے میرا ہاتھ چھوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر انسپکٹر کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آپ فکر مت کرو سر جی! ہم کوئی جنگلی تھوڑی ہیں؟ ہمارے بچے ہیں، ہم ان کو کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ آپ بے فکر ہو کر جاؤ جی!'' نمبر دار نے چالاکی سے کہا تو انسپکٹر ایک لمحے تک اسے گھورتا رہا لیکن نمبر دار کا چہرہ بالکل سپاٹ ہی رہا تھا۔

''چاچا! یہ مار دیں گے ہم دونوں کو، آپ ہم کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔'' ایمان انسپکٹر کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگی۔

شاید وہ انسپکٹر بھی ڈیوٹی کے آگے مجبور تھا۔ فرض کی ادائیگی بھی یہی کہتی تھی کہ جس گاؤں کے بچے ہیں ان کو واپس کر دو اور چلے جاؤ۔ انسپکٹر نے ہم دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نمبر دار سے اس کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی لے

کر انگوٹھا لگوایا اور گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

''ہاں بھئی رضوان علی گھمن صاحب! کیسا لگ رہا ہے؟'' نمبردار میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''نمبردار صاحب! ہم سے غلطی ہو گئی، آپ ہم کو معاف کر دو!'' ایمان جلدی سے آگے بڑھی اور اس نے نمبردار کے پاؤں پکڑ لیے۔نمبردار نے اس کے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔

''کتیا! جب گھر سے اپنے اس یار کے ساتھ بھاگ رہی تھی تب پتہ نہیں چلا تھا کہ غلطی کر رہی ہوں؟''

اس نے ایک ہاتھ سے ایمان کے بال پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے ایک زوردار تھپڑ ایمان کے منہ پر مار دیا۔اس کے تھپڑ سے ایمان کے گال اندر سے پھٹ گئے اور اس کا منہ خون سے بھر گیا۔نمبردار نے اسے بالوں سے چھوڑا تو وہ زمین پر گر گئی اور زمین پر خون تھوکنے لگی۔

''نمبردار صاحب! ایمان کو میں لے کر بھاگا ہوں، جو کچھ کرنا ہے وہ میرے ساتھ کر و لیکن اب کی بار ایمان کو ہاتھ مت لگانا ورنہ تم مجھے اور میرے پورے خاندان کو جانتے ہو!'' میں نے چیختے ہوئے کہا تو اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر بھی جڑ دیا۔

نمبردار کا ہاتھ بہت بھاری تھا۔اس کے تھپڑ نے میرے گال کو بھی اندر سے چیر کر رکھ دیا جس سے میں زمین پر تو نہ گرا لیکن میں بھی ایمان کی طرح خون تھوکنے لگا۔

''میں تجھ کو بھی جانتا ہوں اور تیرے باپ کو بھی! جب اس گاؤں کی عزت کا جنازہ نکال رہے تھے تب تجھے اپنے باپ کا خیال نہیں آیا تھا؟ آج وہ خود اپنے ہاتھوں سے تجھے مارے گا۔تم دونوں کا گندا خون اس گاؤں کی زمین پر گرے گا تو پھر کسی اور کو ایسا کرنے کی جرأت نہیں ہو گی۔''

''راجو! رسی لے کر آؤ اور اٹھا کر الٹا لٹکا دو ان دونوں کو! آج ان کے عشق کا جنون ان کے ناک کے راستے سے نکالتے ہیں۔'' نمبردار نے راجو سے کہا تو وہ کچھ ہی دیر میں اندر پڑی ہوئی رسی لے آیا۔

گاؤں والوں نے مل کر ہم دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر مین چوک میں لگے ہوئے بڑے سے درخت کی ایک موٹی شاخ کے ساتھ الٹا لٹکا دیا۔ہم دونوں کی ٹانگیں شاخ کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں اور سر نیچے ہوا

میں جھول رہے تھے۔

''کیوں! اب پتہ چلا! جب گاؤں کی عزت بھگا کر لے جاتے ہیں تو گاؤں والے کیسے بدلہ لیتے ہیں؟'' نمبردار نے میرے سر کے بالوں کو پکڑ ایک زوردار جھٹکا دیا۔ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''راجو! چھڑی دے مجھ کو!'' نمبردار نے راجو سے چھڑی مانگی تو راجو نے ایک موٹی اور لمبی سی چھڑی اسے پکڑا دی۔

اس چھڑی کو تیل لگا کر خشک کیا گیا تھا جو جانوروں کو مارنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ آج وہی چھڑی ہم دونوں پر استعمال ہونے والی تھی۔ نمبردار نے مجھے بالوں سے پکڑا اور میرا منہ اوپر کی طرف اٹھالیا۔

''کیوں گاؤں والو! ان دونوں نے ہماری گاؤں کی روایت کے خلاف جانے کی کوشش کی ہے، ہماری غیرت کو للکارا ہے۔'' نمبردار اونچی آواز میں تقریر کرنے کے انداز میں پوچھنے لگا تو پورا گاؤں ''ماردو! ماردو!'' کے شور سے گونج رہا تھا۔

''چاچا! ہم سے غلطی ہوگئی ہے، ہمیں معاف کردو!'' مجھے اپنے درد سے زیادہ ایمان کی فکر ہورہی تھی۔

''چھوڑ دوں؟! اگر آج تم جیسے بے غیرتوں کو چھوڑ دیا تو کل کو تم لوگ ہماری بیٹیوں کو بھگا کر لے جاؤ گے۔'' نمبردار نے ایک جھٹکے سے میرے بالوں کو چھوڑا تو میں الٹا ہوا میں لہرانے لگا۔

''دیکھ لو گاؤں والو! جب کوئی لڑکا ہماری بہو بیٹیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو اس کا کیا انجام ہوتا ہے!'' نمبردار نے دونوں ہاتھوں میں چھڑی کو پکڑا اور پوری قوت سے اسے میری کمر پر مار دیا۔

درد کی ایک تیز لہر میرے جسم کے آر پار ہوگئی لیکن میں نے اپنے لبوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ میں نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ الٹا ہونے کی وجہ سے میری قمیض میرے گلے میں آ گئی جسے انہوں نے اتار دیا۔ اب میرا اوپری جسم ننگا تھا۔ تیل میں بھیگی ہوئی چھڑی نے میری کمر کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی تھی۔ پہلی چھڑی کی ضرب سے ابھی میں تھوڑا سنبھلا ہی تھا کہ اس نے دوسری چھڑی مار دی۔ اس کے بعد وہ مسلسل چھڑیاں مارنے لگا۔

نمبردار کی لگائی ہوئی ہر چھڑی درد کے ایک نئے ذائقے سے روشناس کروا رہی تھی۔ میری ٹانگوں سے لے کر

میرے سر تک پورا جسم ادھڑ گیا تھا۔ چھڑی کی ضربوں سے میری ٹانگیں سینہ اور کمر کی کھال پھٹ گئی تھی اور ہر جگہ سے خون نکل نکل کر نیچے زمین پر گر رہا تھا۔

خدا نے ہر انسان کے اندر درد برداشت کرنے کی ایک حد رکھی ہوتی ہے۔ جب درد اس حد سے کراس کر جاتا ہے تو انسانی ذہن نیم بے ہوشی کی کیفیت میں چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد درد کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔

میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ میرا دماغ مجھے بے ہوشی کی کیفیت میں بھیجنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے ساتھ ہی ایمان بھی الٹی لٹکی ہوئی تھی اور مجھے پڑنے والی ہر چھڑی پر اس کی چیخ نکل رہی تھی۔ یہی چیز مجھے بے ہوش ہونے سے روک رہی تھی۔ میری ادھڑی ہوئی چمڑی سے خون نکل نکل کر میری آنکھوں میں بھی جا رہا تھا۔ جس سے میری آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ مجھے ہر طرف خون کی رنگینی نظر آ رہی تھی۔ یمان مجھے دیکھ کر چیخ رہی تھی اور بار بار معافیاں مانگ رہی تھی۔

''چاچا! معاف کر دو، چاچا! معاف کر دو!'' ایمان کی سسکیوں کی آواز میرے کانوں تک آ رہی تھی۔

''چاچا! وہ مر جائے گا، چاچا! وہ مر جائے گا۔۔۔ چاچا معاف کر دو! وہ مر جائے گا۔'' ایمان نے سسکیاں لیتے لیتے رونا شروع کر دیا۔

گاؤں والے گلا پھاڑ پھاڑ کر ہم دونوں کو گالیاں دے رہے تھے اور ہماری موت کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایمان کو روتا ہوا دیکھ کر نمبر دار کو طیش آ گیا۔ اس نے نفرت سے ایمان کی طرف دیکھا اور پوری قوت سے چھڑی میرے سر پر ماری۔ شاید وہ نمبر دار کی نفرت کی انتہا تھی یا میری برداشت کی، میں نے اپنے دانتوں کو سختی سے بھینچا ہوا تھا لیکن پھر بھی ایک زوردار چیخ میرے منہ سے نکل گئی۔ ایمان میری چیخ کی آواز سن کر تڑپ اٹھی۔

''راضی۔۔۔ راضی! مجھے معاف کر دینا، مجھے معاف کر دینا! آج میری وجہ سے مر رہے ہو، مجھے معاف کر دینا!''

''نمبر دار! اب میری باری ہے۔ مجھے بھی اب محبت کی اس سولی پر چڑھا کر دیکھ لو، مجھے بھی اب مر ہی جانا چاہیے۔''

میں شاید اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا جب ایمان کی درد بھری آواز میرے کانوں کو سنائی دی تو

میں دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آیا۔شاید ابھی میرا جانے کا وقت نہیں ہوا تھا۔نمبردار اب مجھے چھوڑ کر ایمان کی طرف چلا گیا۔

''ناں چاچا ناں !ایمان کو مت مارنا!اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' مجھے نمبردار کے ارادوں کا پتہ چل گیا تھا۔

وہ اب ایمان کو مارنے لگا تھا۔میں تو نمبردار کی مار سہہ گیا تھا لیکن ایمان بہت نازک تھی۔وہ نمبردار کی مار سہہ نہ پاتی،اس لیے میں چیخ چیخ کر اسے منع کرنے لگا۔

''کیوں رے طوائف !ایک آدمی سے تمہارا گزارہ نہیں ہوتا تھا جو تو اس کو بھی یار بنا رہی تھی۔سالی!اپنی عمر دیکھ اور اپنے کرتوت دیکھ!'' نمبردار نے اسے بالوں سے پکڑا اور ایک ہاتھ سے اس کے گالوں کو غصے سے مسلنے لگا۔ چھڑی اس نے راجو کو پکڑا دی تھی۔

''چاچا معاف کردو!نہیں چاچا معاف کردو!وہ بچی ہے ابھی چاچا!'' میں اونچی اونچی آواز میں رونے لگا۔

''سالی!تم جیسی طوائفوں کے خون ہی خراب ہوتے ہیں،خود بھی مرتی ہو اور اپنے ساتھ اپنے یاروں کو بھی مروا دیتی ہو!''

نمبردار نے اس کے بال چھوڑ دیئے اور راجو سے چھڑی لے کر اسے ایمان کی پشت پر مارنے لگا۔ایمان چونکہ لڑکی تھی اس لیے اس کی قمیض کو اس کی ٹانگوں کے ساتھ ایک چھوٹی رسی کی مدد سے باندھ دیا گیا تھا۔

نمبردار نے دو تین چھڑیاں ایمان کی کمر پر ماریں تو اس کی قمیض پھٹ گئی اور اس کی کمر ننگی ہوگئی ۔ یہاں قدرت اس پر مہربان ہوگئی،اس کی کمر سے نکلنے والے خون نے اس کی کمر کو اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا اور وہ بے پردہ ہونے سے بچ گئی۔

ایمان واقعی بہت نازک تھی۔وہ اس درد کو برداشت نہ کرسکی اور اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ایمان کی چیخوں کی آواز سن کر مجھے اپنی ساری تکلیف بھول گئی اور میں پاگل ہوگیا۔

''اوئے بزدل!مت مارا سے،وہ بچی ہے۔۔۔۔بہت چھوٹی ہے۔نمبردار!وہ مر جائے گی۔'' میں زور زور سے چیخنے لگا۔

''ادھر آ، میری طرف آ۔۔۔۔ مجھے مار کر دکھا! اسے چھوڑ دے۔ اگر وہ مر گئی تو مجھے اسی ایمان کی قسم ہے میں اس گاؤں کے ایک ایک شخص کو چن چن کر مار دوں گا، میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے مار دے نمبردار! مجھے مار دے!'' میں چیخ رہا تھا لیکن میری چیخوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

''دیکھ! میرا باپ اور بھائی آ گئے تو وہ ہم دونوں کی موت کا بدلہ لیں گے۔ اسے چھوڑ دے نمبردار! ورنہ اس گاؤں میں لاشوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔'' میری باتیں سن کر نمبردار رک گیا تو میں اور زور زور سے چلّانے لگا۔

اچانک مجھے بھیڑ میں سے اپنے ابا کا چہرہ نظر آیا۔ ان کے پیچھے پیچھے طارق اور دونوں دوسرے بھائی بھی آ گئے تھے۔

''اف میرے خدا! تم لوگ میرے بچوں کو مار دینے لگے ہو!'' ابو جلدی سے لوگوں کو ایک طرف ہٹا کر میری طرف آ گئے۔

''دیکھو ریاض! یہ دونوں اس گاؤں کے مجرم ہیں۔'' نمبردار نے ابو کا بازو پکڑنا چاہا لیکن ابو نے ایک جھٹکے سے چھڑا لیا۔

''طارق! ان کے ہاتھ پاؤں کھول کر نیچے اتارو! میرے خدا۔۔۔ یہ دونوں تو مر جائیں گے۔'' ابو نے میرے چہرے کو پکڑا اور بے تحاشہ چومنا شروع کر دیا۔

''ابا! ابا! یہ ایمان کو مار رہے تھے۔ یہ۔۔۔۔ یہ ایمان کو گندی گالیاں دے رہا تھا۔ اس نے ایمان کو مارا ہے۔''

میں اپنے ابو کو دیکھ کر شیر ہو گیا تھا اور نمبردار کی شکایتیں لگانے لگا۔ مجھے اپنی چوٹوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ میں ایمان کا بے پردہ جسم دیکھ کر غصے سے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

''ریاض! تم درمیان سے ہٹ جاؤ، اس نے لڑکی کو بھگایا ہے اور آج یہیں پہ ہم ان دونوں کو سزا دیں گے۔ یہی ہمارے گاؤں کا قانون ہے۔ آج تمہارا بیٹا گندا نکلا ہے تو اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ اس گاؤں کے مجرم ہیں اور ہم لوگ ان کو مار کر ہی دم لیں گے۔'' گاؤں کے دو تین لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے ابو کو دھکا دے

کر مجھ سے الگ کر دیا۔

''طارق اور فاروق! تم دونوں گھر جاؤ اور اسلحہ لے کر آؤ! آج میں بھی دیکھتا ہوں کون میرے بچوں کو مارتا ہے! آج میں ایک ایک آدمی کے بیچ میں سے گزر جاؤں گا۔ خدا کی پناہ! یہ دونوں بچے ہیں اور تم لوگوں نے مار مار کر ان کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دی ہے؟ طارق! تم دونوں اسلحہ لے کر آؤ اور جس جس نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے وہ ادھر کھڑا ہو کر دکھائے میں کسی گھمن کی اولاد نہیں ہوں گا جو میں ایک ایک کو زمین پر بچھا نہ دوں، مجھے حرامی کہہ دینا۔'' ابو نے دھاڑتے ہوئے کہا تو گاؤں والے پیچھے ہٹ گئے۔ میرے ابو ہم دونوں کو الٹا لٹکتے ہوئے دیکھ کر پاگل ہو گئے تھے۔

''ریاض! تم غلط کر رہے ہو! پورے گاؤں والوں کے سامنے تمہاری بدمعاشی نہیں چلے گی۔ اگر ان دونوں نے جرم کیا ہے تو ان کو سزا بھی ملے گی۔ آج تمہارے گھر کی بات آئی ہے تو تم ان اصولوں سے پیچھے ہٹ گئے ہو؟'' نمبردار ابو کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

طارق بھائی نے گھر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ وہ اسلحہ لینے چلا گیا تھا۔

''دیکھو نمبردار صاحب! بات گھر کی یا اصول کی نہیں ہے، بات میرے بیٹے کی ہے! مجھے گاؤں کے اصولوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ مجھے صرف میرا بیٹا چاہیے اور میں اسے لے کر جاؤں گا۔'' ابو نمبردار کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے شعلے ٹپک رہے تھے۔

''ریاض! تم پورے گاؤں سے دشمنی مول لے رہے ہو۔۔۔ پیچھے ہٹ جاؤ! ورنہ ہم گاؤں والے تمہارا جینا محال کر دیں گے۔ تم آج ان کو ادھر سے نہیں لے جا سکتے، پورا گاؤں میرے ساتھ ہے۔ تم کس کس سے لڑو گے؟ مر جاؤ گے! واپس چلے جاؤ۔'' نمبردار اپنی بات پر اڑ گیا تھا۔

بات اب اس کی اپنی عزت پر آ گئی تھی۔ نمبردار اس گاؤں کا چوہدری تھا۔ آج تک کسی نے اس کے آگے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی لیکن آج میرے ابو اس کے آگے کھڑے ہوئے دھاڑ رہے تھے۔

اچانک فضا کلاشنکوف کے برسٹ کی آواز سے گونج اٹھی، یہ طارق بھائی تھے۔ جنہوں نے رائفل کو کاک کر کے اس کا منہ آسمان کی طرف کر کے برسٹ چھوڑا تھا۔ تینوں بھائی اسلحہ سے لیس ہو کر چوک میں آ گئے تھے اور رائفل

کے ایک ہی برسٹ نے گاؤں کے لوگوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ طارق بھائی کے پاس دو رائفلیں تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ایک رائفل ابو کے ہاتھ میں پکڑا دی تو انہوں نے اس کے ہاتھ سے رائفل لے کر ایک طویل برسٹ آسمان کی طرف کر کے چھوڑا اور خونخوار نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ نمبردار ابھی بھی اپنی جگہ پہ جم کر کھڑا تھا۔

''دیکھو گاؤں والو! بے شک میں غریب آدمی ہوں۔۔۔ میرے پاس صرف چار ایکڑ زمین ہے لیکن میں ذات کا جٹ ہوں اور میرے سینے میں شیر کا دل ہے۔ تم میں سے کوئی اب میرے بیٹے کو ہاتھ بھی لگا کر دکھا دے! خدا کی قسم آج میں مر جاؤں گا یا مار دوں گا لیکن اپنے بیٹے کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گا!'' انہوں نے ایک اور برسٹ چھوڑا اور رائفل کی پوری میگزین خالی کر دی۔

''راضی پتر! شیر بن شیر! تمہارا باپ آ گیا ہے۔ ڈرنا مت جب تک یہ چار چار بازو تمہارے پیچھے ہیں کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔''

ان کی رائفل کی میگزین ختم ہو گئی تھی۔ طارق بھائی نے ایک بھری ہوئی میگزین ان کی طرف بڑھائی تو انہوں نے خالی میگزین عامر کو پکڑائی اور بھری ہوئی میگزین کو رائفل سے لگا کر ایک بار پھر کاک کر لی۔ نمبردار کے علاوہ پورا گاؤں پیچھے ہٹ گیا تھا اور دور دور جا کر ٹولیوں کی صورت میں کھڑے ہو گئے تھے۔ بھری ہوئی رائفل کے سامنے کھڑے ہونے کی کسی بھی ہمت نہیں تھی۔ صرف نمبردار ہی اپنی عزت کی خاطر چوک میں کھڑا تھا۔

''جا نمبردار جا!'' ابو نے رائفل کی نال نمبردار کے سینے پر رکھ دی۔

''چلا جا یار! آج باپ اور بیٹے کے درمیان میں مت آ! عزت بچاتے بچاتے کہیں جان سے ہی نہ چلے جانا!'' نمبردار رائفل کی نال کے زور سے ایک فٹ پیچھے ہٹا ضرور مگر پھر بھی وہ کھڑا رہا۔

''تڑ تڑ تڑ تڑ۔۔۔۔'' ایک بار پھر فضا رائفل کے برسٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اب کی بار آواز مجمعے کے باہر سے آئی تھی۔ وہ فیاض تایا تھے۔

''تگڑا ہو جا ریاض بھائی! اپنے پاؤں کی مٹی مت چھوڑنا! دیکھ تیرا بھائی آ گیا ہے۔'' کچھ ہی لمحوں میں فیاض تایا ابو کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی رائفل کی نال بھی نمبردار کے سینے پر ٹک گئی۔

میرے دونوں کزن بھی ہاتھوں میں رائفلیں لیے میدان میں کھڑے تھے۔ یہاں تک کہ میرا چھوٹا بھائی عامر جو کہ صرف دس سال کا تھا اس نے بھی ہاتھ میں پسٹل پکڑی ہوئی تھی۔ نمبر دار کے اپنے بیٹے اور کچھ ملازم بھی رائفلیں لے کر آ گئے تھے لیکن وہ ابھی تک دور دور کھڑے تھے۔ شاید وہ نمبر دار کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

''ابا! آج کسی کو چھوڑ نا مت! مجھے ادھر سے نیچے اتار اور رائفل دے مجھ کو! آج اس نمبر دار کو جانے مت دینا!'' میں چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

''ابا! آج اس کی لاش بچھانی ہے زمین پر! جہاں اس نے ایمان کا خون بہایا ہے میں وہیں اس کی لاش بچھاؤں گا۔'' چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔

''چلا جا یار آج ادھر سے۔۔۔میرے بچپن کا دوست ہے تو!'' ابو نمبر دار سے نرم لہجے میں بولنے لگے۔

''خدا کی قسم! اولاد کی محبت انسان کو بھیڑیا بنا دیتی ہے۔ شاید میں تجھے نہیں مار سکوں گا لیکن میری اولاد آج مار دے گی تجھ کو! اور تجھے مرتا ہوا میں نہیں دیکھ سکتا۔ ہماری بچپن کی دوستی ہے اسی دوستی کی خاطر چلا جا یار! ان بچوں کو چھوڑ دے!'' ابو نے رائفل کی نال نمبر دار کے سینے سے ہٹائی تو تایا نے بھی اپنی رائفل نیچے کر لی۔ نمبر دار نے ایک نظر ابو کے چہرے پر ڈالی دو قدم پیچھے ہٹا اور واپس اپنے لوگوں کے پاس چلا گیا۔

چوک میں اب صرف میرے خاندان کے لوگ ہی رہ گئے تھے۔ ابو نے رائفل کو کندھے سے لٹکایا اور جلدی سے میرے پاس آ کر مجھے نیچے اتارنے لگے۔ طارق بھائی اور دوسرے کزن ابو کی مدد کرنے لگے۔ میری ٹانگیں کھل گئیں تو میں جلدی سے ایمان کی طرف بڑھ گیا۔ ابو نے ایک بڑی چادر ایمان کو دے دی تھی جسے اس نے اچھی طرح اپنے چاروں طرف لپیٹ لیا تھا۔

''ایمان! تو ٹھیک تو ہے نا! تجھے زیادہ درد تو نہیں ہو رہا ہے؟ سوری ایمان! میرے گھر والوں کو دیر ہو گئی اور تجھے اتنے زخم سہنے پڑے۔ دیکھو! اب میری پوری برادری آ گئی ہے۔۔۔تم گھبرانا مت!'' میں شدت جذبات سے ایمان کو بھینچنے لگا۔

ایمان کی کمر چھڑی کی ضربوں سے پھٹ گئی تھی۔ جب میں نے زور سے اسے جھنجوڑا تو اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے تکلیف سے ہلکی سی آہ بھری۔ اس ہلکی سی آہ نے مجھے پھر جانور بنا دیا۔

''ابا! رائفل مجھے دو!'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ابو کے ہاتھ سے رائفل لینے لگا لیکن ابو نے اسے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

''طارق بھائی! رائفل مجھے دو!'' میں طارق بھائی کے ہاتھوں سے رائفل چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

''نہیں راضی پتر! بات اب ختم ہو گئی ہے، اس کو اب مزید بڑھانے کی کوشش مت کرو۔ چلو گھر چلو! یہاں پر اب مزید رکنا ٹھیک نہیں ہے۔'' ابو نے رائفل کو کندھے پر لٹکایا اور مجھے پیچھے سے پکڑ لیا۔

''نہیں ابو مجھے چھوڑ دو! اس نے میری ایمان کو مارا ہے، میں نے اس کو بولا تھا بے شک مجھے جان سے مار دو لیکن میری ایمان کو ہاتھ بھی مت لگانا لیکن ابا اس نے دیکھو ایمان کو کتنی بری طرح مارا ہے۔ ابا! اس نے ایمان کو مارا ہے، میری ایمان کو مارا ہے۔'' میں ابو کے سینے سے لگ کر رونے لگا۔

''کوئی بات نہیں ہے راضی بیٹا! خدا کا شکر ہے تم دونوں مرنے سے بچ گئے ہو۔ زخموں کا کیا ہے آج نہیں تو کل بھر ہی جائیں گے۔'' ابو مجھے سینے سے لگائے تسلی دینے لگے۔

اچانک ایمان نے ایک بار پھر سسکی بھری، شاید اسے ہوش آ گیا تھی۔ میرا دماغ ایمان کی سسکی سے پھر الٹ گیا اور میں نے زور لگا کر ابو کو پیچھے کی طرف دھکا دیا تو وہ زمین پر گر گئے۔ رائفل ان کے کندھے سے گر گئی تھی جسے میں نے اٹھا لیا۔

''نہیں راضی پتر! اب کی بار غلطی مت کر!''

ابو نے چیخ کر کہا تو میرے کزن اور بھائی جلدی سے مجھے پکڑنے کے لیے آگے بڑھے لیکن تب تک میں نے رائفل کا ایک برسٹ زمین کی طرف مار چکا تھا۔ ایک زوردار آواز آئی اور مٹی کا ایک غبار سا اٹھ گیا۔

''کوئی آگے مت آئے! اگر کسی نے آگے آنے کی غلطی کی تو خدا کی قسم میں باپ اور بھائیوں کی پہچان بھول جاؤں گا۔'' میں نے کڑک دار آواز میں کہا تو سب اپنی جگہ پر جم گئے۔

میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ نمبردار کے پیچھے کھڑے اس کے ملازم اور بیٹے بھاگ گئے تھے۔ نمبردار بھی بھاگنے کی تیاری کرنے لگا لیکن میں نے اسے چیخ کر بھاگنے سے روک دیا۔

''ناں نمبردار ناں! گولی سے تیز نہیں بھاگ سکے گا! مردوں کی طرح سینے پر گولی کھا! بزدل مت بن۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے تو شیر تھا تو میں بھی تیرے سامنے شیر بن کے کھڑا تھا۔اب کتا کیوں بن رہا ہے؟'' نمبردار بھاگتے بھاگتے رک گیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''رضوان پتر! مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، مجھے معاف کر دے۔'' سامنے موت دیکھ کر وہ کانپنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے رائفل کی نال اس کے سینے سے لگا دی۔

''نہیں راضی نہیں! محبت کرنے والے کسی سے بدلہ نہیں لیتے! ہم کسی کو مار نہیں سکتے راضی! اگر لوگ تیرے نام کا پتھر بھی ماریں گے تو میں اس پتھر کو چوم کر سینے سے لگاؤں گی۔ تیرے نام کی لگی ہوئی ایک ایک چوٹ مجھے اپنی جان سے بھی پیاری ہے تو پھر اس سے بدلہ کس چیز کا لے رہے ہو؟ چھوڑ دو اسے! بدلہ لینا ہم محبت کرنے والوں کی توہین ہوتی ہے۔'' ایمان میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سمجھانے لگی۔

میرا جنون آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا اور میں نے نمبردار کے سینے سے رائفل ہٹا کر ایمان کے ہاتھ میں دے دی اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایمان کی محبت کے آگے اپنا سر جھکا دیا تھا۔ ایمان نے ایک ہاتھ سے مجھے پکڑ کر اٹھایا اور رائفل نمبردار کے ہاتھ میں پکڑا کر اس کی نال کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔

''نمبردار صاحب! آج تک آپ نے بہت سے محبت کرنے والے دیکھے ہوں گے لیکن جو محبت میں جان دیتے ہیں وہ شاید آج تک آپ نے نہیں دیکھے۔آپ صرف گولی چلاؤ! پیار میں جان کیسے دیتے ہیں یہ میں آپ کو مر کر بتاؤں گی۔ خدا کی قسم! آج اگر جان دیتے ہوئے ہم دونوں میں سے کسی ایک کی سسکی بھی نکلی تو قیامت والے دن میرا گریبان پکڑ لینا۔ چاچا! آپ میرے باپ کی عمر کے ہو، بڑے ہو مجھ سے لیکن آج تک آپ نے محبت کرنے والے دیکھے ہی نہیں ہے۔آپ صرف گولی چلاؤ!'' ایمان نمبردار کو رائفل پکڑا کر اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ابو کی دی ہوئی چادر اس کے پیروں میں پڑی ہوئی تھی۔خون سے لت پت کپڑے اس کے بدن پر لٹک رہے تھے جو جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے لیکن پھر بھی اس کا بدن ڈھانپنے میں کامیاب ہو رہے تھے۔شاید کپڑوں کو بھی ایمان سے محبت تھی جو پھٹے ہونے کے باوجود ایمان کے جسم سے چمٹے ہوئے اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔

''جاؤ! چلی جاؤ ایمان! تمہاری میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم تمہاری محبت سچی ہے یا جھوٹی، مجھے صرف اپنے گاؤں کی عزت پیاری ہے اور میں اسی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اس گاؤں کا نمبردار ہوں اور میں اپنا فرض نبھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' نمبردار نے رائفل کو زمین پر پھینکا اور واپس اپنے گھر چلا گیا۔ ابو ہم دونوں کو لے کر گھر آ گئے۔

امی کو باہر رونما ہونے والے واقعات کا پتہ چل گیا تھا لیکن چونکہ عورت تھی اس لیے وہ اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ رائفل کے برسٹوں کی آواز سن کر اس کا دل گھبرا رہا تھا اور وہ بار بار دروازے کی اوڑ سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوگوں کے رش کی وجہ سے اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

ایک عورت جس کا شوہر اور چار جوان بیٹے اسلحے سے لیس ہو کر گھر سے باہر لڑنے کے لیے کھڑے ہوں اس عورت کی کیا حالت ہو گی۔ اس کا اندازہ شاید آپ نہ لگا سکیں اور میرے پاس بھی الفاظ نہیں ہیں جو ایک ماں کے جذبات تحریر کر سکوں۔

وہ بار بار دروازے تک آتی اور پھر واپس چلی جاتی تھی۔ ابو ہم دونوں کو لے کر گھر آئے تو میری ماں بھاگ کر میرے پاس آ گئی۔ وہ بار بار میرے چہرے کو چوم رہی تھی اور میرے زخموں کو ہاتھ سے سہلانے کی کوشش کرتے ہوئے رو رہی تھی۔

''ثمینہ! اب بس کرو! یہ بے غیرت اتنی سی مار سے مرنے والا نہیں، یہ ہم سب کو مار کر ہی مرے گا۔''

ابو جو باہر میرے ایک ایک زخم کو دیکھ کر چیخ رہے تھے، گھر میں آتے ہی بالکل بدل گئے اور انہوں نے امی کا بازو پکڑ کر انہیں مجھ سے علیحدہ کیا اور ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا۔ میں زخموں سے پہلے ہی چور تھا، ابو کا تھپڑ برداشت نہ کر سکا اور زمین پر گر گیا۔

''کیا کر رہے ہو ریاض؟! میرے بچے کو انہوں نے پہلے ہی مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے اور اب تم بھی اسے مار رہے ہو؟'' امی ایک بار پھر میری طرف بڑھی لیکن ابو نے اسے درمیان سے ہی روک لیا۔

ابو نے ایک بار پھر امی کو مجھ سے دور کر کے ایک زوردار لات میرے پیٹ پر ماری۔ پیٹ پر پڑنے والی لات نے مجھے درد سے دوہرا کر دیا۔

''خبردار! جو کسی نے بھی اس سے ہمدردی کرنے کی کوشش کی۔اس بے غیرت کی وجہ سے آج میں اور میرا پورا خاندان مرنے والا تھا۔اس کو اندر کمرے میں بند کر کے باہر تالا لگا دو! کوئی کھانا نہیں،کوئی پینا نہیں۔دو دن بھوکا اور پیاسا رہے گا تو ساری عاشقی اس کے ناک کے راستے باہر آجائے گی۔اور کان کھول کر سن لو تم سب لوگ! اگر تم میں سے کسی نے بھی اس سے بات کرنے کی یا اسے کچھ بھی کھانے کے لیے دینے کی کوشش کی تو میں اس کو گھر سے باہر نکال دوں گا۔ یہ میرا گھر ہے جس کو رہنا ہے رہے اور جس کو میری بات پر اعتراض ہے وہ اس گھر کو چھوڑ کر جا سکتا ہے۔''

ابو نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے اندر کمرے میں لے جا کر پھینک دیا اور باہر سے تالا لگا کر چابیاں اپنی جیب میں ڈال لیں۔ پورے گھر والے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''طارق! تم اپنے بھائی کو لے کر بیٹھک کی چھت پر چڑھ جاؤ۔ دیکھو! پوری رات اسلحے کے ساتھ پہرہ دینا ہے۔نمبردار بہت کمینہ آدمی ہے وہ آرام سے نہیں بیٹھے گا،وہ آج رات کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔عامر گھر کے اندر رہ کر پہرہ دے گا۔بس بیٹا! سونا نہیں ہے۔آج کی رات خیریت سے گزر گئی تو کل صبح پنچائیت میں جا کر صلح کرنے کی کوشش کروں گا۔ پنچائیت میں جا کر اگر ایک بار معافی مانگ لوں گا تو امید ہے معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ''

''بیٹا چھت پر دیوار کے زیادہ نزدیک آنے کی کوشش مت کرنا۔اگر تم نے چھت پر کھڑا ہونے یا باہر جھانکنے کی کوشش کی تو باہر سے ہٹ ہو جاؤ گے۔ زیادہ بہادری مت دکھانا اور زندہ رہنا! ہم سب کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔'' ابو نے طارق بھائی کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور دونوں بھائیوں کو بیٹھک کی چھت پر بھیج دیا۔

''فیاض بھائی! اب آپ بھی اپنے گھر چلے جاؤ! صبح فجر کی نماز پڑھ کر آ جانا پھر سرپنچ کے پاس جائیں گے۔صبح صبح ہی پنچائیت بیٹھ گئی تو ہماری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔'' ابو تایا کو کہنے لگے لیکن وہ گھر جانے پر نہ تیار ہوئے۔ انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو گھر بھیج دیا اور خود ابو کے ساتھ ہی پہرہ دینے لگے۔

ابو نے ایک چھوٹی پسٹل ارم کے ہاتھوں میں بھی دیدی اور ایمان کے علاوہ سب اسلحے سے لیس پہرہ دے رہے تھے۔

''چاچو! میں چائے بنا کر لا دوں؟'' ایمان نے ڈرتے ڈرتے ابو سے پوچھا تو ابو کو ایمان کی موجودگی کا احساس ہوا۔ گھر کی پریشانی میں وہ ایمان کو بھول ہی گئے تھے۔

''نہیں ایمان! میں نے چائے پینی چھوڑ دی ہے۔ میں نے تم کو دل سے بیٹی بولا تھا لیکن شاید تم بیٹی کہلانے کے قابل نہیں تھی۔ تم تو محبت کرنے کے قابل بھی نہیں ہو۔ نمبردار کے ہاتھ میں جس طرح تم نے رائفل پکڑا ا اپنی محبت کا اعلان کیا تھا، وہ محبت نہیں تھی۔ تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ محبت کی میم کا بھی ابھی تم کو پتہ نہیں ہے۔ محبت یہ ہے جو میں کر رہا ہوں اپنی بیوی اور بچوں کے لیے۔ محبت اوپر چھت پر پہرہ دے رہی ہے۔ آج پوری رات کی ایک ایک گھڑی ایک ایک پل رائفل کی نوک پر گزار دیں گے اپنے اس بے غیرت بیٹے کے لیے۔۔۔۔۔ محبت یہ ہے۔

لوگ تو آروں سے چیز دیئے جاتے ہیں لیکن ان کے ماتھے پر ایک شکن تک نہیں آتی تو پھر تم سے ایک بوڑھا اور مجبور شخص برداشت کیوں نہیں ہو سکا۔ کیا تھا! اگر تم اس آدمی کے ساتھ اپنی زندگی کے کچھ اور سال گزار دیتی! تم سے تو تین سال بھی نہیں گزارے گئے اور تم محبت میں جان دینے کی بات کرتی ہو۔ محبت میں جان ہر کوئی دے سکتا ہے لیکن اس محبت کی خاطر بارہ سال جانور صرف رانجھا ہی چرا سکا تھا۔ تم تو صرف تین سال میں ہی بھاگ گئی ہو۔

نہیں ایمان! تم نے محبت نہیں کی ہے۔ تمہیں صرف اپنی ذات سے ہی غرض تھی۔ ادھر آؤ! ارم میرے پاس آؤ!'' ابو نے ارم کو بلایا تو وہ ابو کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''ارم بیٹی! بتاؤ اپنی اس چھوٹی بہن کو کہ تم بھی اس سے محبت کرتی ہو۔ یہ عامر بھی تو تم سے محبت کرتا ہے۔۔۔ پوچھ لو اس سے!'' ابو نے عامر بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ایمان! میں تو آج بھی تم سے محبت کرتی ہوں!'' ارم نے ایمان کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ وہ ایمان کے پاس بیٹھنا چاہتی تھی لیکن ابو نے اسے دور کر دیا۔

''ایمان! ان لوگوں کا کیا قصور ہے جو تم سے پیار کرتے ہیں۔ آج تمہاری وجہ سے میرا پورا خاندان رائفلیں ہاتھ میں لیے بیٹھا ہے اور تم کہتی ہو کہ ہم لوگوں نے آج تک کوئی محبت کرنے والا نہیں دیکھا؟ چائے کا پوچھتی ہو مجھ سے؟ آج سے میں نے چائے پینا چھوڑ دی ہے۔ بس اپنی بیٹی کے ہاتھوں چائے پینے کا شوق تھا۔۔۔۔ جب بیٹی ہی نہیں رہی تو پھر چائے کیسی؟''

''ثمینہ! اس کے زخموں پر مرہم لگا دو۔ لڑکی ہے، اگر زخموں کے نشانات اس کے جسم پر رہ گئے تو اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔''

ابو امی سے مرہم لگانے کا کہہ کر باہر صحن میں پڑی چار پائی پر بیٹھ گئے۔ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا آرام سے گزر گیا۔ ہم لوگ کی پریشانی کچھ کم ہو گئی تھی۔ اچا

نک باہر رائفل کے ایک طویل برسٹ کی آواز آئی اور پھر اس کے بعد لگا تار فائرنگ ہونے لگی۔ نمبر دار اپنے ہرکاروں کے ساتھ باہر آ گیا تھا اور ہوائی فائرنگ کر رہا تھا۔ ابو نے طارق بھائی کو بھی سمجھا دیا تھا۔ وہ چھت کے درمیان میں لیٹے ہوئے تھے۔ ہماری طرف سے کسی نے بھی فائرنگ کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس لیے شاید وہ شیر ہو گئے تھے۔ اگلے دس پندرہ منٹ تک مسلسل فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں۔

''ریاض! ایمان ہمارے گاؤں کی مجرم ہے اسے ہمارے حوالے کر دو اور تمہارے بیٹے کا معاملہ پنچائیت میں حل کر لیں گے۔ تم صرف ایمان کو ہمارے حوالے کر دو تو ہم چلے جائیں گے۔ ورنہ آج تم سب کی موت ہمارے ہی ہاتھوں لکھی ہوئی ہے۔'' نمبر دار باہر بازار میں زور زور سے چلّا رہا تھا۔

اسے معلوم تھا ابو کبھی بھی اپنے بیٹے کو مرنے نہیں دیتے لیکن چونکہ ایمان اس کے ملازم کی خریدی ہوئی عورت تھی اس لیے وہ ایمان کو ہی مار کر اپنی دہشت بٹھانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا اگر ایمان کو مار بھی دیا تو کوئی بھی پوچھنے والا نہیں ہوگا، اس لیے وہ صرف ایمان کو لے جانے کی بات کر رہا تھا۔

ابو کے بدلے ہوئے رویے سے ایمان سہم گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابو اسے نمبر دار کے حوالے کر کے اپنے گھر والوں کی جان بچا لیں گے۔ اس لیے وہ ڈر کر امی کی بانہوں میں چھپنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ ارم بھی ایمان سے لپٹ کر اسے اپنے ہونے کا احساس دلانے لگی۔

''ثمینہ! تم ارم اور ایمان کو لے کر اندر کمرے میں چلی جاؤ اور دروازہ اندر سے بند کر لو!'' ابو نے امی کو اندر کمرے میں جانے کا کہا تو امی دونوں لڑکیوں کو لے کر اٹھ گئیں اور کمرے کی طرف جانے لگیں۔

''ایمان!'' ابو نے ایمان کو آواز دی تو ایمان چلتے چلتے رک گئی اور پیچھے مڑ کر ابو کی طرف دیکھنے لگی۔

''ایمان! یہ ٹھیک ہے کہ آج کے بعد میں تم کو کبھی بھی اپنی بیٹی نہیں مانوں گا۔ تم میری بیٹی نہیں ہو لیکن پھر بھی کسی

کی بیٹی تو ہو! اور یہ باپ اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے کسی کی بیٹی کی جان نہیں لے سکتا۔ یہ لوگ اگر تم تک پہنچے بھی تو مجھے اور میرے چاروں بیٹوں کو مار کر اور ہماری لاشوں کو پھلانگ کر تم تک پہنچیں گے۔''

ابو نے ایمان سے کہا اور رائفل کو کاک کر کے ایک طویل برسٹ چھوڑ کر بتا دیا تھا کہ گھر کے اندر ہم لوگ ایسے ہی نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ مر کر یا مار کر ہی ایمان کو ہمارے گھر سے لے جا سکتے ہیں۔ ہماری فائرنگ کے جواب میں باہر سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ ہمارے گھر میں گولیوں کا اتنا سٹاک نہیں تھا، اس لیے ابو فائرنگ کرنے میں احتیاط کر رہے تھے۔

باہر والے شاید بوریوں میں بھر کر گولیاں لائے تھے کہ ان کی فائرنگ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ نمبردار فائرنگ کے ساتھ ساتھ اونچی آواز میں گالیاں بھی دے رہا تھا۔ ابو کو پتہ تھا کہ یہ صرف غیرت دلانے کا ایک طریقہ ہے۔ اگر جواب میں وہ کوئی حماقت کر دیتے تو معاملہ حل ہونے کی بجائے مزید بگڑ جانا تھا۔ غلطی ہم لوگوں کی تھی اس لیے ابو معاملے کو بگڑنے سے بچانا چاہتے تھے۔

طارق بھائی ابھی نوجوان تھے۔ آخر کب تک یونہی نمبردار کی گالیاں سنتے رہتے۔ ان کے جوان خون نے جوش مارا اور وہ بیٹھک کی چھت پر کھڑے ہو گئے اور رائفل کا رخ نمبرداروں کے بیرونی دروازے کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔

وہ لوہے کا ایک بھاری دروازہ تھا۔ جب گولیاں اس دروازے پر برسیں تو ہر طرف آگ کی چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ رائفل کے برسٹ نے اس دروازے کو چھلنی کر دیا تھا۔ گولیوں کے ٹکرانے کی آواز اتنی گرجدار تھی کہ اندر کمرے میں لیٹے ہوئے میرے کانوں میں درد ہونے لگا تھا تو باہر والوں کا کیا حال ہوگا جو بازار میں دروازے کے نزدیک کھڑے تھے۔ باہر کھڑے لوگوں کا جدھر منہ لگا انہوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں میں ہی پورا بازار خالی ہو گیا تھا۔

ہمارے دیہاتوں میں اکثر گھر میں داخل ہونے کے لیے دو دروازے ہوتے ہیں۔ ایک مین داخلی گیٹ ہوتا ہے جو گھر کے تمام افراد استعمال کرتے ہیں۔ ٹریکٹر اور دوسری گاڑی وغیرہ بھی اسی گیٹ سے اندر جاتی ہے۔ دوسرا بیٹھک کا دروازہ ہوتا ہے جو مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی بیٹھک میں اندر ایک اور دروازہ ہوتا

ہے جو گھر کے اندر کھلتا ہے۔ نمبر دار اور اس کے بیٹے اسی دروازے کو استعمال کرتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے تھے۔

جب انسان بالکل بے بس ہو جاتا ہے تو پھر وہ وحشی جانور بن جاتا ہے۔ طارق بھائی بھی وحشت سے چنگھاڑ چنگھاڑ کر فائرنگ کر رہے تھے اور ان کے راستے میں جو بھی آتا وہ یقیناً مارا جاتا۔ اس لیے سب بھاگ گئے تھے۔ طارق بھائی کا جنون ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے چھت سے نیچے چھلانگ لگائی اور نمبر دار کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر فائرنگ شروع کر دی۔ رائفل کی میگزین خالی ہو گئی تو انہوں نے اسے زمین پر پھینکا اور دوسری میگزین لگا کر ایک بار پھر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ پورے بازار میں اکیلے کھڑے نمبر داروں کو گالیاں دے رہے تھے لیکن اب کی بار اندر سے مکمل خاموشی ہو گئی تھی۔

لوہے کا بھاری دروازہ مضبوط ضرور تھا لیکن آخر کب تک گولیوں کے سامنے کھڑا رہتا؟ لگاتار گولیوں کی بوچھاڑ سے دروازہ دھڑام سے نیچے آ گرا۔ طارق بھائی دروازے کے اوپر سے ہوتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ اتنی دیر میں ابو اور تایا بھی طارق کے پیچھے پہنچ گئے تھے۔ اندر گھر کے صحن میں سامنے کی طرف ایک قطار میں چار کمرے تھے جن کے دروازے ہلکی لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ نمبر دار اور اس کی فیملی انہیں کمروں میں اندر سے کنڈی لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ طارق بھائی نے رائفل کا منہ ایک دروازے کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا لیکن رائفل کی دوسری میگزین بھی خالی ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک بڑی سی گالی نمبر دار کو دی اور خالی میگزین اتار کر دوسری میگزین لگانے لگے۔ ابو اور تایا ان کے پیچھے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے طارق بھائی کو پیچھے سے پکڑ لیا۔

''نہ پترنا! ایسی غلطی مت کرنا!'' اگر ان کا ایک بھی آدمی مر جاتا تو ہماری یہ دشمنی ہماری اگلی کئی نسلوں کو کھا جاتی۔

''نہ پترنا!'' ابو طارق بھائی کو منع کرنے لگے۔

اگر ان دونوں کو آنے میں تھوڑی دیر اور ہو جاتی اور طارق بھائی میگزین لگا لیتے تو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے دروازے گولیوں کا راستہ کبھی بھی نہ روک سکتے تھے اور جتنا جنون اس وقت طارق بھائی کو چڑھا ہوا تھا، اندر موجود ایک بھی آدمی آج زندہ نہیں بچنا تھا۔ لیکن خدا نے ابھی ان لوگوں کی زندگی لکھی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ بچ گئے۔ ابو طارق بھائی کو واپس لے کر گھر آ گئے۔ طارق بھائی اپنی دہشت کا نشان چھوڑ آئے تھے۔ لوہے کا وہ بھاری دروازہ

ہماری دہشت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔نمبردار نے آج کے دن دوبارا پنی موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا تھا اور وہ اب کی بار بہت زیادہ ڈر گیا تھا۔یہی ڈر صبح پنچائیت میں بھی کام آ گیا۔

صبح جب ابو ہم دونوں کو پنچائیت میں لے کر گئے اور انھوں نے پنچائیت میں جا کر پورے گاؤں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی۔ ہمارے گاؤں کے بڑے بڑے چوہدری لوگ سامنے چار پائیوں پر سینہ تان کر بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ میرے ابو کل بھرے بازار میں ہم دونوں مجرموں کو فائرنگ کے زور پر چھڑا کر لے گئے تھے۔ اس لیے آج وہ بھی مجرم کی طرح معافی مانگ رہے تھے۔

میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے ابو کو ان لوگوں کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔میرے تینوں بھائی اور ہماری پوری برادری گاؤں والوں کے ساتھ کھڑی ابو کو زمین پر بیٹھتے اور نمبردار سے معافی مانگتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یہ ذلّت کی انتہا تھی لیکن آج میرے ابو صرف میری خاطر اپنی ایک بے غیرت اولاد کی خاطر یہ ذلّت برداشت کر رہے تھے۔

تایا ابو نے ہم دونوں کو اشارہ کیا تو میں اور ایمان بھی ابو سے ایک قدم پیچھے زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور اپنے دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں باندھ کر اپنے سروں کو جھکا لیا۔ یہ معافی مانگنے کا انداز تھا۔ابو اور ہم دونوں اپنے سروں کو جھکائے پنچائیت کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔

''ریاض! میں نے اور پوری پنچائیت نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان دونوں بچوں نے گھر سے بھاگ کر غلطی کی اور ان کی یہ غلطی بہت بڑی ہے۔اگر آج ان کو سزا نہ ملی تو کل کو ہماری بچیاں بھی گھر سے بھاگیں گی۔اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس لڑکے کو بازار میں درخت سے باندھ کر پچاس کوڑے مارے جائیں اور چونکہ یہ لڑکی شادی شدہ ہے اور اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود تمہارے لڑکے کو ورغلایا ہے اور اسے گھر سے بھاگنے پر اکسایا ہے تو اس کو سنگسار کر دیا جائے۔اس کے خاوند کو ۳۰ ہزار کی ادائیگی پنچائیت مل کرادا کر دے گی اور پولیس وغیرہ کا معاملہ نمبردار حل کرے گا۔اگر کسی شخص کو اعتراض ہے تو وہ بتا سکتا ہے۔'' سرپنچ نے کھڑے ہو کر اعلان کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا سر اٹھایا اور ایمان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پہلے ہی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ انتہائی سفید چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سفید ہو گیا تھا۔سمندر کی طرح گہری خاموشی اپنی موت کا اعلان سن کر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ انتہائی کامل عشق یہی تو ہوتا ہے جب انسان اپنے محبوب کے نام کی سولی پر چڑھ جاتا ہے۔ ایمان میرے نام کی سولی

چڑھنے لگی تھی اس لیے وہ مطمئن ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کھولا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''سر پنچ صاحب! گھر سے بھاگنے پر مجبور ایمان نے نہیں بلکہ میں نے کیا تھا۔ میں ہی ایمان کو گھر سے بھگا کر لے گیا تھا۔ ساری غلطی جب میری ہے تو پھر آپ ایمان کو سزا کیوں دے رہے ہو؟ ایمان ایک زر خرید بیوی ہے، اس کا شوہر نمبرداروں کا نوکر ہے اور اس کا کوئی بھی آگے پیچھے نہیں ہے اس لیے آپ ایمان کو مار کر اپنی جھوٹی دہشت کی دھاک بٹھا رہے ہو؟ میرے پیچھے میری پوری برادری کھڑی ہے اس لیے آپ کا زور مجھ پر نہیں چل رہا اور آپ ایمان کو اکیلی سمجھ کر اسے سنگسار کرو گے۔ اس ایمان کے پیچھے میں کھڑا ہوں اور مجھے قسم ہے اسی ایمان پر لگی ایک ایک چوٹ کی۔۔۔۔ میں اس پورے گاؤں کو قبرستان بنا دوں گا۔ مجھے مار دو سر پنچ صاحب! ورنہ میں تم سب کو مار دوں گا۔'' میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

ابو میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مارا اور مجھے دوبارہ زمین پر بٹھا دیا۔ میں نے چونکہ اپنی بات مکمل کر لی تھی اس لیے خاموشی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ لیکن اب کی بار میں نے اپنے سر کو نہیں جھکایا بلکہ سامنے بیٹھی ہوئی پوری پنچائیت کو گھورنے لگا۔

''سر پنچ صاحب! بچہ ہے آپ معاف کر دو! میں اسے سمجھا دوں گا۔ ان دونوں بچوں نے گھر سے بھاگ کر غلطی کی ہے اور کل نمبردار صاحب نے ان کو مار مار کر سزا بھی دے دی تھی۔ اس لیے آپ ان دونوں کو معاف کر دیں اور ایمان کی جان بھی بخش دیں۔ آج کے بعد آپ کو دونوں کی طرف سے کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' ابو سر پنچ کو معاف کر دینے کا بولنے لگے۔

ذرا سی دیر میں پنچائیت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ آدھے لوگ ہم دونوں کو معاف کر دینے اور آدھے سزا دینے کے حق میں ہو گئے تھے۔ آنے والا ایک ایک پل ہم دونوں کے بھاری ہو رہا تھا۔ آخر کار پنچائیت ایک فیصلے پر متفق ہو گئی اور سر پنچ نمبردار کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے! ہم لوگ ایمان کو معاف کر رہے ہیں لیکن ریاض کو یہ وعدہ دینا پڑے گا کہ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ ایمان کو دوبارہ اس کے شوہر کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ چونکہ ان دونوں نے غلطی کی ہے اس لیے ان دونوں کا منہ کالا کر کے ان کو گدھے پر بٹھا کر پورے گاؤں کا ایک چکر لگایا جائے تاکہ پورے گاؤں کو ان کی کالی

کرتوتوں سے عبرت حاصل ہو۔ میرے اس فیصلے پر اب کوئی بھی اعتراض نہیں کرے گا۔'' سرپنچ نے اپنا فیصلہ سنایا تو میں نے اطمینان کی ایک بھرپور سانس لی۔

منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھانا اور پورے گاؤں کا چکر لگانا شاید گاؤں کے لیے ایک بڑی سزا ہو لیکن میرے لیے یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ایمان کی جان بچ گئی تھی اور ایمان کی جان کے بدلے میں پھانسی پر چڑھنے کے لیے تیار تھا تو پھر منہ کالا کرنا کیا چیز تھی۔ اگلے دو منٹ میں ہی راجو نمبر دار کے گھر سے روٹیاں پکانے والا کالا ''توا'' لے کر آ گیا۔ وہ توا لکڑیوں کی آگ سے جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔

شہروں میں تو کھانا پکانے کے لیے گیس یا بجلی والے چولہے استعمال ہوتے ہیں لیکن ہمارے گاؤں میں ابھی تک لکڑیوں سے آگ جلا کر کھانے پکانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ گیس ہمارے گاؤں میں ابھی تک نہیں آئی اور بجلی اس وقت بھی دن میں صرف سات آٹھ گھنٹے ہی آتی ہے۔ بجلی بہت زیادہ مہنگی ہونے کی وجہ سے ہم لوگ کھانا بجلی والے چولہے پر نہیں پکا سکتے۔ چونکہ لکڑی کپاس کے پودوں سے وافر مقدار میں حاصل کی جاتی ہے اس لیے بہاولپور کے نواحی گاؤں میں زیادہ تر لوگ لکڑیاں جلا کر ہی کھانا پکاتے ہیں۔

''چلو! اب دونوں ایک دوسرے کے منہ کالک سے کالا کرو اور پورے گاؤں کے سامنے ہاتھ باندھ کر معافی مانگو!'' نمبر دار نے ہم دونوں کے سامنے توا لا کر رکھ دیا۔

''چلو! یہ کالک ایک دوسرے کے منہ پر لگاؤ!'' میں نے توے کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور ایمان کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگا۔

اچانک ایمان زیر لب مسکرائی اور توے کی بیک سائیڈ پر ہاتھ رکھ کر اپنے ہاتھ پر کالک لگانے لگی۔ جب بہت زیادہ کالک اس کے ہاتھ پر لگ گئی تو اس نے وہ ہاتھ میرے چہرے پر پھیرنا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں میرا پورا چہرہ کالا ہو گیا تھا۔ سارے گاؤں والے میرے سیاہ چہرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میں نے ایمان کے سیاہ ہاتھ کی طرف دیکھا۔

''ایمان! تمہارا ہاتھ کالا ہو گیا ہے۔'' میں بے اختیار اپنی قمیض کے پلو سے ایمان کا ہاتھ صاف کرنے لگا۔

''اوئے مجنوں! اپنی لیلیٰ کے ہاتھ مت صاف کرو بلکہ اس کتیا کا منہ کالا کرو۔'' نمبر دار نے انتہائی حقارت

سے ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر رسید کرتے ہوئے کہا۔

طارق بھائی مجھے یوں تھپڑ کھاتے ہوئے دیکھ کر آگے بڑھے لیکن ابو نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ معاملہ بہت آسانی سے ختم ہو رہا تھا اور وہ اسے پھر سے خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ طارق بھائی ابو کا اشارہ سمجھ گئے اور دوبارہ اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔

''منہ کالا کرو اس کتیا کا!'' نمبردار نے ایک اور تھپڑ مجھے مارا اور توا میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

وہ ایمان کو کتیا کہہ رہا تھا جس سے ایک بار پھر میرا دماغ گھومنے لگا۔ لیکن ایمان نے بروقت میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جنونیت سے باہر نکال لیا۔

''راضی! منہ کالا کرو میرا یار! عورتیں اپنے محبوب کے لیے سجتی اور سنورتی ہیں۔ دیکھو! آج میں بھی تو اپنے محبوب کے لیے سج اور سنور رہی ہوں۔ محبوب تو بنو گے نا میرے راضی!'' اس نے میرے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ایمان کے چہرے کو کالا کرنے کے لیے اپنے ہاتھ پر کالک لگانے لگا۔

''جلدی کرو!'' نمبردار نے چیختے ہوئے کہا تو میں نے اپنے کالے ہاتھ کو ایمان کے سفید چہرے پر پھیرنا شروع کر دیا۔

ایمان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ ایمان کا گورا سفید چہرہ آہستہ آہستہ کالا ہونا شروع ہو گیا۔ گاؤں والے پہلے سے زیادہ زور زور سے ہنسنے لگے۔ ابو نے میرے چھوٹے بھائی عامر کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ رونے لگ گیا تھا۔

ہمارے گھر میں شاید عامر ہی سب سے زیادہ ایمان سے محبت کرتا تھا۔ ایمان بھی اس کا اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح خیال رکھتی تھی۔ میری پوری برادری اس وقت غم زدہ تھی لیکن جس کا چہرہ کالا ہو رہا تھا وہ غم زدہ نہیں تھی۔ ہاں! ایمان بالکل بھی غم زدہ نہیں تھی۔ جب ایمان کا چہرہ کالا ہو گیا تو میں نے ہاتھ ہٹا لیا اور اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔

''راضی! کیسی لگ رہی ہوں، اچھی لگ رہی ہوں نا میں؟ کہتے ہیں محبت سچی ہو تو عورت کو بہت رنگ چڑھتا ہے۔ کیوں راضی! میری محبت سچی ہے نا؟ دیکھ لو آج تیرے نام کا بھی رنگ میرے چہرے پر چڑھ گیا ہے۔ عورتیں تو

محبوب کے نام کی سرخ مہندی لگاتی ہیں ہاتھوں پر، دیکھو! آج میں نے تمہارے لیے کالی مہندی لگائی ہوئی ہے۔''
اس نے میرے سامنے اپنا ہاتھ کر دیا۔

''راضی! خوبصورت لگ رہی ہوں نا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سر ہلا دیا۔

اتنی دیر میں دو گدھے بھی آ گئے تھے۔ پنچائیت کے لوگوں نے ہم دونوں کو گدھوں پر بٹھایا اور ہم دونوں گاؤں کے گرد چکر لگانے لگے۔ شام کو جب ہم دونوں کی سزا ختم ہوگئی تو ابو نے اس شرط پر ایمان کو اسلم کے حوالے کیا کہ وہ ایمان کو کچھ بھی نہیں کہے گا۔

''دیکھو اسلم! ایمان اپنے کیئے کی سزا بھگت چکی ہے۔ اگر تم نے کسی بھی قسم کی ایمان کو تکلیف دی تو پھر تم مجرم ہو گے اور اسی درخت کے ساتھ تم کو الٹا لٹکا دیں گے۔ اس لیے اگر تم ایمان کو رکھنا چاہتے ہو تو اسے لے جاؤ، وہ تمہاری بیوی ہے اور تمہارا حق ہے اس پر۔ لیکن اگر تمہاری غیرت ایمان کو برداشت نہیں کر سکتی تو اسے چھوڑ دو!''

''ریاض تم کو ایمان کا ایک لاکھ روپیہ دے رہے ہیں۔ تم ایمان کے بدلے ایک لاکھ روپیہ ابھی لے سکتے ہو۔''
سرپنچ نے اسلم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

لیکن اسلم نے ایک لاکھ کی بجائے ایمان کو ساتھ لے جانے کی حامی بھری اور ایمان کا بازو پکڑ کر اسے اپنے گھر لے گیا۔

گھر میں آتے ہی حسبِ معمول ابو نے مجھے کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگایا اور باہر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

''ریاض! بچہ کل سے بھوکا ہے آج بھی سارا دن گدھے پر بیٹھ بیٹھ کر وہ مرنے کے قریب ہو گیا ہے۔ چھوڑ دو اسے اب! میرا بچہ غلطی نہیں کرے گا۔ صرف ایک روٹی کھانے کے لیے دے دو۔ میرے بچے نے کبھی ایک رات بھی کھانے کے بغیر نہیں گزاری اور آج دوسرے دن سے بیچارہ بھوک سے مر رہا ہے۔''

امی ابو کی منتیں کرنے لگی لیکن ابو پر ان کی باتوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ میری آنکھوں میں موجود محبت اور میرے لہجے سے پھوٹتی ہوئی محبت کی چنگاریاں ابو کو جلا رہی تھیں۔ آنے والے دن ہم لوگوں کے لیے مزید مشکل ہونے والے تھے۔ اس رات میرے اور ایمان دونوں کے گھروں

میں کوئی بھی نہیں سویا تھا۔

ابو سچ کہتے تھے کہ؛

''محبت صرف محبت کرنے والوں کو ہی نہیں جلاتی بلکہ وہ اپنے راستے میں آنے والے سب لوگوں کو جلا دیتی ہے۔محبت راستوں کو تباہ کر دیتی ہے۔''

پتہ نہیں یہ محبت اب کس کس کو جلاتی ہے اور کون کون سا راستہ تباہ کرتی ہے۔اس کا پتہ تو اب آنے والے دنوں میں چلے گا۔ میں ساری رات کمرے میں جاگتا رہا۔ مجھے بھوک سے زیادہ ایمان کی فکر ہو رہی تھی۔ آدھی رات کے قریب میرا دل بھاری ہونا شروع ہو گیا تو میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔گھر والے ابو کی وجہ سے خاموشی سے میری چیخیں سنتے رہے۔آخر امی سے رہا نہ گیا تو وہ دروازے کے پاس آ کر مجھ سے تکلیف کا پوچھنے لگیں۔

''امی آپ ایک بار ایمان سے جا کر پوچھ لو۔امی پلیز! آپ ایمان کے گھر کا ایک چکر لگا آؤ۔وہ اسلم کے پاس اکیلی ہے۔'' میں دروازے کی دوسری طرف کھڑا ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

ایمان اسلم کے پاس اکیلی تھی۔ وہ اس کا شوہر تھا۔بے شک غریب آدمی تھا لیکن پھر بھی غیرت مند تو وہ بھی تھا اور اگر اس کی غیرت تھوڑا سا بھی ابالا کھا جاتی تو وہ ایمان کو کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا۔

''امی! آپ ابو کو بھیجو وہ ایمان کو دیکھ آئے۔اگر اس کو کچھ ہو گیا تو آپ کا بیٹا بھی مر جائے گا۔''

''چپ کر بے غیرت! وہ اپنے شوہر کے گھر میں ہے۔ہم لوگ اس کے کیا لگتے ہیں جو آدھی رات کو اس کا پتہ کرتے پھریں!'' ابو دروازے کے پاس آ گئے تھے۔

''تم اپنے سر سے محبت کا یہ بھوت اتار دو اور اپنی پڑھائی پر دھیان دو!''

''نہیں ابو! آپ ایک بار ایمان کو دیکھ آؤ، وہ مار دے گا ایمان کو۔۔۔۔ مجھے پتہ ہے۔ابو! وہ ایمان کو مار دے گا اور اگر وہ مر گئی تو میں بھی مر جاؤں گا۔ ہاں ابو! ایمان کو بچا لو۔۔۔۔۔۔ مجھے بچا لو! میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔'' میں زور زور سے چیختے چیختے رونے لگ گیا۔

ابو کو میری حالت پر ترس آ گیا اور وہ طارق بھائی کو ساتھ لے کر ایمان کے گھر چل دیئے۔ ابو نے تین چار بار اسلم کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ابو کچھ دیر تک باہر انتظار کرتے رہے جب کوئی بھی جواب نہیں آیا تو انہوں نے طارق کو اشارہ کیا اور طارق بھائی دروازے پہ پاؤں رکھ کر دیوار پہ چڑھ گئے۔ انہوں نے دوسری طرف صحن میں چھلانگ لگائی اور اندر کی طرف سے دروازہ کھول دیا۔

ایمان اور اسلم اندر کمرے میں تھے اور ایمان کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ابو ایمان کی آوازیں سن کر تیزی سے اندر کمرے کی طرف بھاگنے لگے۔ کمرے کو اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ اسلم رسی کا ایک پھندا بنا کر اسے چھت میں لگے ہوئے لوہے کے گاڈر میں ڈال رہا تھا۔ وہ ایمان کو پھانسی دے کر مارنا چاہتا تھا۔ اگر ابو کو آنے میں تھوڑی دیر ہو جاتی تو وہ ایمان کو مار چکا ہوتا۔ وہ آرام سے ایمان کو چھت میں لگے ہوئے گارڈر سے لٹکا کر مارتا اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیتا۔ صبح اس نے شور مچا دینا تھا کہ ایمان نے چھت سے لٹک کر خودکشی کر لی ہے۔

سارے گاؤں نے ایمان کی حالت دن کو دیکھ لی تھی اسی لیے سارا گاؤں ایمان سے نفرت کر رہا تھا۔ کسی کو بھی شک نہ ہوتا اور ایمان کی خودکشی پہ گاؤں والے بھی خوش ہو جاتے۔ لیکن میرے دل نے مجھے وقت سے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ میرے دل نے جب اچانک دھڑکنا بند کر دیا تو مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ایمان کسی مصیبت میں پھنسنے والی ہے۔ یہی تو وہ محبت کا کنکشن ہوتا ہے جو قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔

ابو جلدی سے کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے اسلم کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ دو تین تھپڑ کھا کر ہی زمین پر گر گیا اور ابو سے معافیاں مانگنے لگا۔ لیکن ابو اسے زمین پر گرے ہوئے کو ہی مارنے لگے۔ ابو کو دیکھتے ہوئے طارق بھائی بھی اسلم کو مارنے لگے۔ ابھی اسلم کو دونوں طرف سے مار پڑ رہی تھی اور وہ اونچی اونچی آواز میں چلّا چلّا کر معافیاں مانگ رہا تھا۔

نمبردار کا گھر بھی ہمارے گھروں کے ساتھ ہی تھا۔ بہت زیادہ شور سن کر ان کے گھر سے دو تین ملازم باہر آ گئے اور انہوں نے ابو کو اسلم سے علیحدہ کیا۔ نمبردار بھی اسلم کے گھر آ گیا تھا۔ اور وہ ایمان کو بندھا ہوا دیکھ کر معاملے کی گہرائی تک پہنچ گیا اور اس نے تین چار تھپڑ اسلم کو رسید کئے اور ایمان کی رسیاں کھول کر اسے اپنے گھر لے گیا۔ ابو اور طارق بھائی بھی گھر آ گئے۔

وہ رات ایمان نے نمبر دار کے گھر میں گزاری۔ اگلے دن اسلم نے پنچائیت میں جا کر معافی مانگی اور ایمان کو گھر لے جانے کی بات کی لیکن میرے ابو نے اپنی برادری کو ساتھ ملایا اور ایمان کو اسلم کے ساتھ نہ بھیجنے کا کہا۔ چونکہ پنچائیت نے ایمان کی جان بخش دی تھی اس لیے اسلم اب ایمان کو نہیں مار سکتا تھا۔ پھر بھی اسلم نے ایمان کو لٹکانے کی کوشش کی تھی اس لیے پنچائیت نے ایمان کو نمبر دار کے گھر بھیج دیا۔ اگلے ایک سال تک ایمان نمبر دار کے گھر صفائی کرتی رہی۔ نمبر داروں کو ایک مفت کی ملازمہ مل گئی تھی جس کو وہ جتنی مرضی گالیاں دیتے وہ آگے سے کبھی کچھ نہیں بولتی تھی۔ بس خاموشی سے سارا دن کام کرتی رہتی تھی۔

ایمان کی ساری شوخیاں اور شرارتیں سب ختم ہو گئی تھیں۔ محبت کی آگ میں جل جل کر وہ کوئلہ بن رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں وحشت کا نمونہ بن رہی تھیں۔ نمبر دار کے گھر میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں کو ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ نمبر دار کے دونوں بیٹوں نے ایمان کو اکیلی دیکھ کر اسے چھیڑنے کی کوشش کی لیکن ایمان کا غصہ دیکھ کر وہ ڈرتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتے۔

میں نے ان چھ مہینوں میں پتہ نہیں کتنی بار ایمان سے ملنے کی کوشش کی لیکن ایمان مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میری اور میرے گھر والوں کی حالت دیکھ کر ایمان سمجھ گئی تھی کہ میں اور وہ کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتے، ہمارا ملن اس دنیا میں کبھی بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ایمان کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہماری یہ چھوٹی سی محبت ہمارے پورے خاندان کو ختم کر سکتی تھی، اس لیے وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ہمارے گھر والوں نے صرف تین سال تک ایمان کو عزت اور پیار دیا تھا۔ اب وہ اسی پیار اور محبت کی خاطر اپنی اس چھوٹی سی محبت سے دور ہو گئی تھی۔

شہزادہ تو آگ کا دریا پار کر کے شہزادی کو دیو کی قید سے آزاد کروانے آ گیا تھا لیکن میری اس کہانی میں شہزادی نے ہی جانے سے انکار کر دیا تھا۔

ایمان کی آنکھوں کی وحشت دن بدن طاقت پکڑ رہی تھی۔ آخر کار نمبر دار کی بیوی نے ایمان کے آگے ہاتھ باندھ لیے اور نمبر دار کو کہہ کر ایمان کو اسلم کے پاس بھیج دیا۔ ایمان نمبر داروں کے گھر سے نہیں جانا چاہتی تھی لیکن چونکہ نمبر دار کی بیوی کو ایمان سے ڈر لگنے لگ گیا تھا، کیونکہ اس کے دونوں بیٹے جوان تھے اور وہ ایمان کے سائے سے اپنے بیٹوں کو بچانا چاہتی تھی۔

اسلم ایمان کو دوبارہ پا کر خوش ہو گیا۔ خدا بھی بار بار ایمان کو اسی شخص کی جھولی میں ڈال رہا تھا جس کو ایمان کی

اہمیت کا احساس ہی نہیں تھا۔ خدا کے کام کرنے کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھی بغیر مانگے ہی سب کچھ دے دیتا ہے اور کبھی کبھی آپ ساری زندگی ہی کسی ایک چیز کو مانگنے میں گزار دو وہ آپ کو نہیں دے گا۔ یہی سب کچھ بھی میرے ساتھ ہو رہا تھا حالانکہ مجھے ایمان کی ضرورت تھی۔

ایمان کے جانے کے بعد میں گاؤں کی مسجد میں زیادہ وقت گزارنے لگا تھا۔ کالج تو میں نے ایک سال پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب تو سارا سارا دن مسجد میں گزر جاتا تھا۔ ہاں! نمبرداروں کے گھر کے دروازے کو دیکھنا بھی میرا معمول بن گیا تھا۔ میں ہر روز دن میں تقریباً بیس پچیس بار ضرور اس دروازے کو دیکھتا جس کی دوسری طرف میری ایمان بیٹھی ہوتی تھی۔

آٹھ دس مرتبہ رات کو میں نے دیوار پھلانگنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن کامیاب ایک بار بھی نہیں ہوا تھا۔ ہر بار پکڑا جاتا اور نمبردار کے نوکروں سے مار کھا کر آ جاتا تھا۔ کپڑوں اور کھانے کا ہوش ایک سال پہلے سے ہی نہیں رہا تھا۔ امی اور ارم پکڑ کر جو کھلا دیتیں وہ کھا لیتا اور جو وہ دے دیتیں وہ خاموشی سے پہن لیتا تھا۔ ابو کو لگتا تھا شاید کچھ عرصہ کے بعد میں ٹھیک ہو جاؤں گا اور وہ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

اس دن ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی۔ آسمان پر ہر طرف بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں بیٹھک کی چھت پر کھڑا ہو کر کبوتروں کو آسمان پر اڑتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ آزاد پرندوں کو آسمان پر آزادی سے اڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسلم ایمان کو نمبرداروں کے گھر سے لے کر نکلا تو میری نظر ایمان کے چہرے پر پڑ گئی۔ ایمان نے سر اٹھا کر بیٹھک کی چھت کی طرف دیکھ لیا تھا۔ اس کی نظر میری نظر سے مل گئی تھی اور محبت ایک بار پھر تازہ ہو گئی تھی۔

ایمان ایک سال تک مجھ سے نہیں ملی تھی اور مجھ سے دور رہی تھی۔ اسے لگا شاید میں اس سے نہیں ملوں گا، دوبارہ اپنی زندگی میں آ جاؤں گا اور اسے بھول جاؤں گا۔ اسے شاید ابھی میری محبت کا اندازہ نہیں ہوگا۔

محبت عورت بھی کرتی ہے اور مرد بھی کرتا ہے۔ عورت جب محبت کرنے پر آتی ہے تو وہ اپنے آپ کو بھی فنا کر لیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مرد بہت کم محبت کرتا ہے۔ زیادہ تر مرد ہمیشہ محبت کے نام پر دھوکہ ہی دیتے ہیں۔ لیکن یہی مرد جب محبت کرنے پر آتا ہے تو پھر وہ خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔

میں ابھی خدا کو تو نہیں بھولا تھا لیکن ایمان کے لیے اپنی ذات کو فنا کر دیا تھا۔ مجھے خدا کی ضرورت تھی، اسی خدا سے تو میں ایمان کو مانگ رہا تھا۔ مسجد میں نمازیں بھی تو اسی خدا کی پڑھ رہا تھا تاکہ ان نمازوں میں ایمان کی دعائیں کر سکوں۔ واقعی ایمان ابھی بہت معصوم اور کم عمر تھی۔ میری محبت کی شدت کا اسے اندازہ نہیں ہوا تھا۔ میں بیٹھک کی چھت سے ایمان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

وہی سفید چہرہ اور اس کے اوپر بڑی بڑی سبز آنکھیں۔۔۔۔۔۔وہ نظریں میری آنکھوں سے گزر کر میرے سینے کو چیر دیتی تھیں۔ میں زیادہ دیر تک اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا اور چکرا کر وہیں بیٹھک کی چھت پر ہی گر گیا۔ ایمان مجھے چھت پر گرتے ہوئے دیکھ کر میرے گھر کی طرف بڑھی لیکن اسلم نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ایمان صرف ایک لمحے کے لیے ہی ڈگمگائی تھی۔ جلد ہی وہ سنبھل گئی اور اسلم کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے بھی ہوش آ گیا اور میں جلدی سے نیچے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن تب تک ایمان اپنے گھر جا چکی تھی۔ میں جلدی جلدی چھت سے نیچے اترنے لگا۔ ایمان ایک سال سے نمبردار کے گھر میں تھی اور اس سے ملنے کے لیے میں نے ہر حربہ استعمال کر لیا تھا لیکن ناکام رہا۔ ہر روز میری چھوٹی بہن ارم میرا پیغام لے کر ایمان کے پاس جاتی تھی لیکن ایمان نے کبھی بھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ میں نے پتہ نہیں کتنی بار اس سے معافیاں مانگی تھیں لیکن وہ مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

آج یوں سرِ بازار ایمان کو دیکھ کر میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ اسلم کے گھر آ گئی تھی اور آج بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اپنی محبت کا عکس میں نے اس کی سبز آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ اسی محبت کے عکس کو دیکھ کر ہی میں اپنے ہوش گنوا کر چھت پر گر گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اسلم کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ لیکن جب کسی نے بھی دروازہ نہ کھولا تو میں نے ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھا اور چھلانگ لگا کر دیوار پر چڑھ گیا۔

''اوئے اسلم! ایمان کو ہاتھ مت لگا!'' مجھے دیوار پر چڑھتا دیکھ کر اسلم ایمان کو مارنے لگا۔

''طوائف عورت! تمہاری وجہ سے میری پوری زندگی تباہ ہو گئی ہے! آج تجھے یہاں آئے ہوئے دس منٹ بھی نہیں ہوئے اور تمہارے عاشق میرے گھر کی دیواریں بھی پھلانگنے لگے ہیں۔'' اسلم اپنا سارا غصہ ایمان پر ہی نکال رہا تھا۔ میں نے دیوار سے چھلانگ لگائی اور گھر کے اندر آ گیا۔

''دیکھ اسلم! اس کو ہاتھ مت لگاؤ! میں تمہارے ہاتھ توڑ کر تمہارے سامنے رکھ دوں گا اگر تم نے ایمان کو ہاتھ

بھی لگایا۔'' میں ایمان اور اسلم کے درمیان میں آ گیا۔اسلم ایمان کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیوں؟ کیا کرے گا؟ وہ میری بیوی ہے اور جو میرا دل کہے گا میں وہی کروں گا،تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟'' اسلم نے مجھے گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''تم میرے گھر کی دیوار پھلانگ کر آئے ہو، یہ شریفوں کا گھر ہے کوئی کوٹھا نہیں ہے!''

''اسلم! جو کہنا ہے کہو! لڑنا ہے یا مرنا ہے جو دل کرتا ہے کرو لیکن میری ایمان کو کچھ بھی نہ کہو۔اگر اس کو ہاتھ لگاؤ گے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔'' میں نے چیختے ہوئے کہا تو اس نے تین چار تھپڑ میرے چہرے پر مارے اور مجھے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور خود ایمان کو بالوں سے پکڑ لیا۔

وہ ایمان کو گالیاں دینے کے ساتھ ساتھ مار بھی رہا تھا۔میں ایک بار پھر زمین سے اٹھا اور اسلم کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ سے عمر اور جسامت میں کئی گنا بڑا تھا۔اس نے ایمان کو چھوڑا اور مجھے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ادھر صحن میں ہی ایک بڑی سی لاٹھی پڑی ہوئی تھی۔اس نے وہ لاٹھی اٹھائی اور ہم دونوں کو زمین پر پڑے ہی مارنا شروع کر دیا۔وہ غصے میں گالیاں بھی دے رہا تھا اور لاٹھیاں بھی مار رہا تھا۔میں ایمان کے آگے ہو کر اسے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جب وہ مارتے مارتے تھک گیا تو اس نے لاٹھی زمین پر پھینکی اور ایمان کو بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔وہ انتہائی بے دردی سے ایمان کے بال کھینچ رہا تھا اور اسے تھپڑ مار رہا تھا۔ایمان تکلیف کی شدت سے چلا رہی تھی۔مجھ سے ایمان کی تکلیف دیکھی نہ گئی اور میں جلدی سے زمین سے اٹھا اور گھر سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔دروازے کی اندرونی کنڈی کھول کر میں باہر بازار میں آ گیا۔

جگہ جگہ لاٹھی سے پڑنے والی چوٹوں کی وجہ سے مجھ سے صحیح طرح سے چلا نہیں جا رہا تھا لیکن جیسے تیسے کر کے میں اپنے گھر میں آ گیا۔گھر والے سب ایک کونے میں بیٹھے گپ شپ کرنے میں مصروف تھے۔کسی نے بھی میری طرف دیکھنے کی زحمت نہ کی۔اس لیے کسی کو بھی میری چال کی لنگڑاہٹ نظر نہ آئی۔میں خاموشی سے اندر کمرے میں چلا گیا۔

ابو کے سوٹ کیس کے اندر اسلحہ پڑا ہوتا تھا۔مجھے معلوم تھا اس لیے سیدھا اسی سوٹ کیس کے پاس گیا اور اسے

کھول کر اندر سے ایک پسٹل نکال کر اس کی گولیاں وغیرہ چیک کیں اور اسے قمیض کے نیچے چھپا کر باہر آ گیا۔ میں اسی خاموشی کے ساتھ ہی گھر سے باہر آ گیا۔ گلی کراس کی اور واپس ایمان کے گھر کے باہر آ گیا۔

دروازہ کھلا ہی تھا اور اسلم ابھی تک ایمان کو مار رہا تھا۔ ایمان رو رہی تھی، چلا رہی تھی مگر اسلم پر اس کی چیخوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا بلکہ وہ بدستور اسے مارے جا رہا تھا۔

''اسلم ایمان کو چھوڑ دے!'' میں نے گرجدار آواز سے اسلم کو مخاطب کیا اور پسٹل نکال کر کاک کر لیا۔

''کیوں؟ تمہاری بہن لگتی ہے یہ کتیا؟ اور یہ جو پسٹل پکڑی ہوئی ہے اسے چلانا بھی آتا ہے نا؟'' اسلم نے ابھی تک ایمان کے بال پکڑے ہوئے تھے۔

''اسلم! محبت کرتا ہوں اس کتیا سے، کتا ہوں اس کا۔۔۔۔۔۔ درمیان سے ہٹ جا ورنہ کاٹ کے رکھ دوں گا! تم نے پاگل کتے تو بہت دیکھے ہوں گے؟ آج اس کتے کو بھی دیکھ لو!'' میں نے غرّاتے ہوئے کہا۔

''نہیں راضی! کچھ بھی مت کرنا! میں ٹھیک ہوں، تم خدا کے لیے چلے جاؤ یہاں سے!'' ایمان کو میری آنکھوں سے نکلنے والے انگارے نظر آ گئے تھے اس لیے وہ مجھے گھر سے چلے جانے کا کہنے لگی۔

''نہیں ایمان! آج تمہارا یہ کتا کہیں نہیں جائے گا، مارنا ہے یا مر جانا ہے لیکن تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جانا!''

''چھوڑ دے اسلم ایمان کو اور میرے سامنے کھڑا ہو کر دکھا!'' میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا لیکن اسلم پر میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بدستور ایمان کے بال پکڑے ہوئے تھے۔

''کیوں؟ کیا کرے گا؟ فائر مارے گا مجھے؟ ہاں! فائر مارے گا؟ بیٹا! فائر مارنے کے لیے ہمت چاہیے، اتنا بڑا دل چاہیے ہوتا ہے کسی کو مارنے کے لیے!'' اس نے ایمان کے بال چھوڑے اور ہاتھ سے بڑے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''نہ راضی نا! کچھ مت کرنا! بس خاموشی سے چلے جاؤ'' ایمان زمین پر گر گئی تھی لیکن وہ جلدی سے اٹھ کر مجھے منع کرنے لگی۔

اسلم نے ایمان کو پکڑ لیا اور زمین پر گرا کر لاتوں سے مارنے لگا۔ اسلم بے دردی سے اس کی پسلیوں میں ٹانگیں

مار رہا تھا اور ایمان اپنے دانتوں کو مضبوطی سے دبا کر اپنی چیخوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ اگر اس کی ایک بھی چیخ نکل گئی تو میں نے اسلم کو فائر مار دینا ہے اور پھر ساری زندگی جیل میں گزار دینی ہے۔ وہ اپنی اذیتوں کو میرے لیے برداشت کر رہی تھی۔ میری برداشت ایمان کو مار کھاتے ہوئے دیکھ دیکھ کر ختم ہو رہی تھی۔

''اسلم!'' میں زوردار آواز کے ساتھ چیخا تو اس نے ایمان کو چھوڑا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیوں کیا ہوا ہے؟ مجنوں کو درد ہو رہا ہے؟ بچے ادھر دو پسٹل مجھے دو! یہ بچوں کے کھیلنے کی چیز نہیں ہے۔'' وہ ایمان کو چھوڑ کر میری طرف بڑھنے لگا۔

''سوری ایمان! کتے نے آج کاٹ لیا ہے۔'' میں دو قدم پیچھے ہٹا پسٹل کو اسلم کے سینے کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔

''ٹھاہ۔۔۔۔''

''راضی!'' پستول اور ایمان کی چیخنے کی آواز ایک ساتھ ہی آئی۔

گولی پسٹل سے نکلی اور اسلم کے بازو کو چیرتے ہوئے دوسری طرف سے نکل گئی اور وہ زمین پر گر گیا۔

کھلونے پسٹل اور اصلی پسٹل میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اصلی پسٹل بہت زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ اور جب گولی چلتی ہے تو اس کا پیچھے کی طرف اچھا خاصا جھٹکا لگتا ہے۔ جب گولی پسٹل سے نکلی تو پسٹل نے پیچھے کی طرف جھٹکا کھایا اور وہ میرے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر گر گئی۔

نیوٹن کا عمل اور ردِ عمل والا قانون شاید قدرت نے میرے لیے ہی بنایا تھا۔ اگر پسٹل میرے ہاتھوں سے نہ گرتی تو میں نے دوسرا اور پھر تیسرا فائر بھی مار دینا تھا اور اسلم ادھر ہی مارا جاتا۔ شاید قدرت نے ابھی اس کی مزید عمر لکھی ہوئی تھی۔ پسٹل کی صرف ایک ہی گولی نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گولی نے اس کے پورے بازو کو چیر کر رکھ دیا تھا اور وہ زمین پر اذیت سے تڑپنے لگا۔

''نہیں راضی نہیں! اف خدایا! یہ تو نے کیا کر دیا۔'' اسلم کو زمین پر تڑپتے ہوئے دیکھ کر ایمان پاگل ہو گئی اور اس نے اٹھ کر مجھے گریبان سے پکڑ لیا۔

''راضی! یہ تو نے کیا کر دیا۔۔۔ مار دیا اسلم کو؟'' اس نے ایک ہاتھ سے میرا گریبان پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میرے چہرے پر تھپڑ مار رہی تھی۔

''راضی! تو نے اپنی اور میری ہم دونوں کی ہی زندگی تباہ کر دی ہے۔'' وہ اونچی آواز سے روتے ہوئے لگاتار مجھے تھپڑ مار رہی تھی اور میں اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑا ایمان کے تھپڑ کھا رہا تھا اور سات آسمانوں سے بھی اوپر بیٹھا ہوا خدا شاید ہم دونوں کی بے بسی دیکھ رہا تھا۔

شیکسپیئر نے ٹھیک ہی لکھا تھا کہ:

''دنیا ایک سٹیج ہے اور ہم سب اس سٹیج پر آ کر اپنا اپنا ڈرامہ دکھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔''

بہاولپور کے اس دور افتادہ ریگستانی گاؤں میں بھی سٹیج لگی ہوئی تھی اور اس سٹیج پر تین کیریکٹر اپنا اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ ایک زمین پر پڑا درد کی اذیت سے تڑپ رہا تھا اور دو ایک دوسرے کی محبت کی اذیت سے تڑپ رہے تھے۔ میں اور ایمان دونوں ہی تڑپ رہے تھے اور میری اذیت اس گولی کھائے ہوئے اسلم سے بھی زیادہ تھی۔

پسٹل کے فائر کی آواز سن کر سب سے پہلے میرے گھر والے ہی اسلم کے گھر پہنچے اور اسلم کو زمین پر تڑپتے اور ایمان کو میرا گریبان پکڑے مارتے ہوئے دیکھا تو وہ ساری بات ہی سمجھ گئے۔ اتنی دیر میں نمبردار کے گھر سے ملازم اور دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ انہوں نے جلدی سے اسلم کے بازو پر پٹی باندھ کر اس کا خون روکا اور اسے نمبردار کے بڑے بیٹے کے حوالے کر دیا جو اسے لے کر اڈے پر موجود کلینک لے گیا۔ نمبردار بھی گھر میں ہی تھا اور اس کو سارے واقعے کا پتہ چل گیا تھا، اس نے اپنی کار نکالی اور تھانے کی طرف چل پڑا۔ وہ تھانے میں رپورٹ لکھوانے گیا تھا۔

گاؤں میں چاہے جتنی بھی لڑائی ہو، پولیس کبھی بھی نمبردار کی اجازت کے بغیر گاؤں میں نہیں آتی تھی۔ گاؤں کے سارے معاملات نمبردار اور پھر پنچائیت ہی حل کرتی تھی۔ لیکن معاملہ اگر آتشیں ہتھیار یا قتل وغیرہ کا ہوتا تو پھر پولیس دخل اندازی ضرور کرتی تھی۔

چونکہ اسلم کو فائر لگا تھا اس لیے نمبردار اس کی رپورٹ لکھوانے خود تھانے چلا گیا تھا۔ مجھے نمبرداروں کی حویلی کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ میں حویلی کے اس اندھیرے کمرے کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ آنے والے حالات کا ڈر مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن چہرے پر ایک بھی پشیمانی کی لکیر نہیں تھی۔

اس نے میری ایمان کو مارا تھا، اس کو گالیاں دی تھیں اور اسے کتیا کہا تھا تو پھر میری اس محبت کا کیا فائدہ؟ جو اپنے محبوب کو مار کھاتے ہوئے دیکھ کر خاموش رہ جاتی۔ لوگ تو محبت کے لیے جان سے بھی چلے جاتے ہیں تو پھر میں بھی ایمان کی محبت کی خاطر پھانسی پر چڑھ جاؤں گا۔

مجھے صرف ایمان کی فکر ہو رہی تھی۔ مجھے اگر پھانسی ہو جاتی تو میرے بعد میری ایمان کا کیا ہوتا؟ یہی فکر مجھے ستائے جا رہی تھی۔ دو تین گھنٹے ہی گزرے تھے کہ پولیس بھی آ گئی اور مجھے کمرے سے باہر نکال لیا گیا۔ باہر چوک میں میرے ابو اپنی برادری کے ساتھ کھڑے تھے اور مجھے نفرت سے دیکھ رہے تھے۔ تقریباً پورا گاؤں ہی ادھر چوک میں اکٹھا ہو گیا تھا۔

''جی انسپکٹر صاحب! اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟ دیکھ لو! یہ تو ابھی بچہ ہے اور اسلم بھی بچ گیا ہے۔ اب آپ کی کیا مرضی ہے وہ آپ زیادہ بہتر جانتے ہو۔'' نمبردار نے اے ایس آئی کو انسپکٹر کہتے ہوئے کہا تو اے ایس آئی تھوڑا چوڑا ہو گیا۔

''نمبردار صاحب! اسلم بچ تو گیا ہے لیکن پھر بھی عدالتی کارروائی تو ہو گی ہی نا! ہمیں گرفتاری تو کرنی ہی ہے۔ رپورٹ لکھی گئی ہے اس لیے ہمیں بھی اوپر جواب دینا ہوتا ہے۔'' انسپکٹر نے مکّاری سے کہا۔

''سر جی! یہ تو ابھی بچہ ہے، اگر تھانے چلا گیا تو آپ کو تو پتہ ہے اس بیچارے کی ساری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ آپ کچھ مہربانی کریں، میں اسلم کا معاملہ دیکھ لوں گا۔ آپ تھوڑے بہت پیسے لے کر بچے کی جان چھوڑ دیں۔'' نمبردار نے انسپکٹر کو کہا تو وہ سوچنے لگا۔

''نہیں نمبردار صاحب! معاملہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے، ہاں! پرچہ ابھی کسی کے بھی نام نہیں ہے۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ بچے کی جگہ پر اس کے باپ ریاض کو لے جا سکتا ہوں۔ پرچہ اس کے نام پر کاٹ دوں گا۔ اسلم چونکہ بچ گیا ہے اس لیے کل تک ریاض بھی تھانے سے باہر آ جائے گا، ایک رات تو ان کو تھانے میں رکھنا ہی پڑے گا۔''

انسپکٹر پیسہ بنانے کے چکر میں تھا۔ اگر وہ ابو کو تھانے لے جاتا تو پھر وہ ہم سے اپنی مرضی کی رقم نکلوا سکتا تھا۔ یہی ہمارے پاکستانی معاشرے کا کالا چہرہ ہے۔ ہمارے حکمران تو صرف روڈ اور پل بنانے میں لگے ہوتے ہیں لیکن مختلف محکموں کو ٹھیک کرنے کی ذمہ داری کوئی بھی نہیں اٹھاتا۔ اسی لیے پاکستان میں فوج کے علاوہ شاید ہی کوئی

ادارہ ایسا ہو جہاں رشوت اور سفارش نہ چلتی ہو۔

''ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب! میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ، آپ میرے بچے کی بجائے میرے نام پر پرچہ کاٹ دیں۔'' ابو نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تو انسپکٹر مان گیا۔

انہوں نے ابو کو پولیس وین میں بٹھایا اور انہیں لے کر تھانے چلے گئے۔ میں اب آزاد ہو گیا تھا۔ اس لیے خاموشی سے اپنے گھر آ گیا جہاں ہر کوئی نفرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ امی تایا کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

''بھائی جان! اب کیا کرنا ہے؟ آپ طارق کو لے کر ان کے پیچھے تھانے چلے جاؤ! کوشش کریں کہ رات تک ریاض گھر آ جائیں۔'' امی کے چہرے پر پریشانی سے لکیریں سی بن گئی تھیں۔

''جی بھابھی! میں کوشش تو ضرور کروں گا۔ رضوان نے اسلم کو فائر مار کر اچھا تو نہیں کیا اور نمبردار بھی ہمارے خلاف ہے۔ وہ اپنی پوری طاقت لگا دے گا مگر ریاض بھائی کو تھانے سے باہر نہیں نکلنے دے گا۔ ہم غریب لوگ ہیں کہاں تک اس کا مقابلہ کریں گے؟ میں کوشش کرتا ہوں سرپنچ کو بھی ساتھ لے جاؤں گا تھانے، شاید کچھ کام بن جائے۔ آپ دعا کرنا!'' تایا نے فکرمندی سے کہا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''بھائی جان! یہ کچھ زیورات ہیں میرے اور ارم کے کانوں کی بالیاں بھی ہیں۔ آپ ان کو بیچ کر پیسے اکٹھے کر لینا!'' امی نے سونے کی ایک چھوٹی سی پوٹلی تایا کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''جی بھابھی! اب پیسوں کی ضرورت تو پڑے گی ہی۔۔۔۔۔۔ میرے گھر کے حالات بھی آپ لوگوں کے سامنے ہیں مگر تھانے میں دینے کے لیے پیسے تو چاہیے ہی ہیں!'' تایا نے امی کے ہاتھ سے پوٹلی لے لی اور اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''طارق بیٹا! اندر سے دوسری رقم بھی لے آؤ۔'' امی نے طارق بھائی سے کہا تو اس نے رقم اٹھائی اور تایا کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔

مجھے اچانک پیٹ میں درد سا ہونے لگا۔ شاید یہ بھوک کی وجہ سے تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور امی کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔

''امی! مجھے بھوک لگی ہے، مجھے کھانا دے دو۔'' میں نے بے تاثر چہرے کے ساتھ امی سے کہا تو وہ خاموشی سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

''امی! بھوک لگی ہے۔۔۔''

''ارم! بھائی کو کھانا دے دو اسے بھوک لگی ہے۔'' امی نے ارم سے کہا اور خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''بھائی کھانا کھالو!'' ارم نے ایک چھوٹی کٹوری میں سالن رکھا اور اس کے ساتھ ایک روٹی دے دی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے روٹی سالن پکڑا اور کھانے لگا۔ ارم اٹھ کر امی کے پاس چلی گئی تھی۔ میں نے کھانا کھایا اور اندر کمرے میں ایک طرف رکھی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ پیٹ کے درد میں کچھ افاقہ ہو گیا تھا اس لیے میں تھوڑی ہی دیر میں سو گیا۔

''راضی! تم نے اپنی اور میری ہم دونوں کی ہی زندگی تباہ کر دی۔'' اچانک ایمان کی چیخنے کی آواز آئی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

یہ ایک چھوٹا سا خواب تھا لیکن اس خواب نے مجھے ایک بار پھر بے چین کر دیا۔ میں جلدی سے چارپائی سے اٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اسلم کے گھر کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ میں تالے کو دیکھ کر نمبردار کے گھر کی طرف چل پڑا اور ان کے دروازے پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ دروازہ نمبردار کے ایک نوکر نے کھولا۔ میں نے اسے ایمان کو بلانے کا کہنے لگا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے زبردستی گھر کے اندر گھسنے کی کوشش کی تو ان کے مزید ملازم آ گئے اور انہوں نے مجھے تین چار تھپڑ رسید کیے اور دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ میں غصے سے انہیں گالیاں دیتے ہوئے اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

میں ایک بار پھر پسٹل لینے گیا تھا۔ جب میں ایمان کے لیے کسی ایک کو فائر مار سکتا تھا تو پھر میں سب کو مار سکتا تھا۔ گھر میں داخل ہو کر میں سیدھا اسی اسلحے والے سوٹ کیس کے پاس گیا۔ سوٹ کیس کھولا تو وہ اندر سے خالی تھا۔ ابو نے اسلحہ صبح ہی کسی اور جگہ چھپا دیا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح دائیں بائیں ہاتھ مارنے لگا لیکن مجھے کہیں بھی کوئی اسلحہ نہیں ملا۔

میں نے گوشت کاٹنے والی ایک بڑی چھری اٹھائی اور دوبارہ نمبرداروں کے گھر کے سامنے آ گیا۔ میرے ہاتھ میں چھری دیکھ کر نوکر ایک بار تو پریشان ہوئے لیکن پھر وہ سب ایک ساتھ ہی مجھ پر جھپٹ پڑے۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے چھری چھین لی اور پھر سب مل کر مجھے مارنے لگے۔

میں مسلسل ان سے مار کھا رہا تھا لیکن وہاں سے جا نہیں رہا تھا۔ میں نے جب ایک بار ایمان سے ملنے کا ارادہ باندھ لیا تھا تو پھر آج ایمان سے ملے بغیر نہیں جانا تھا۔ نوکر مجھے مارتے مارتے تھک گئے اور میرے سارے کپڑے خون سے تر ہو گئے تھے۔ میرے جسم سے نکلنے والے خون نے ان نوکروں کے کپڑوں کو بھی رنگین کر دیا تھا۔

''جا چلا جا رضوان یار! کیوں فضول میں ایک شادی شدہ لڑکی کی خاطر اپنی اور اپنے خاندان کی عزت مٹی میں رول رہا ہے۔'' نمبردار کا بڑا بیٹا بازار میں کھڑا مجھے مار کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب نوکر مجھے مارتے مارتے تھک گئے تھے تو اس نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا تھا۔

''رضوان! اتنی بھی کیا محبت ہے۔ تمہارا باپ تھانے میں بند ہے۔ دیکھو لو آج اکیلے ہی مار کھا رہے ہو۔ کدھر گئے تمہارے بھائی اور تمہاری برادری؟ آج کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں آیا ہے۔ جاؤ اور اپنے باپ کو تھانے سے نکالنے کی فکر کرو یار! اس لڑکی کے چکر میں پڑ کر کیوں اپنی زندگی تباہ کر رہے ہو؟'' نمبردار کے بیٹے نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں بڑی دیر تک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

''یار! یہی تو محبت ہے۔ بس ایک بار ایمان کا چہرہ ہی دکھا دو! میں ایک بار ایمان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بار پلیز!'' میں نے اس کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''نہیں رضوان۔۔۔'' ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے زمین پر بیٹھ کر اس کے پکڑ لیے۔

''میں ایمان کے بغیر نہیں رہ سکتا یار! بس ایک بار، صرف ایک بار ہی اس کا چہرہ دکھا دو!''

میں اس کے پاؤں پکڑے زمین پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر گھر کے اندر چلا گیا۔ اس کے پاؤں میرے ہاتھوں سے نکلے تو میں وہیں سجدے کی حالت میں زمین پر بیٹھ گیا۔ میرا ماتھا زمین پر ٹکا ہوا تھا اور میں خدا سے ایمان کی زندگی کے سکھ مانگ رہا تھا۔

''راضی!'' ایمان کی نحیف سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے نظر اٹھا کر نمبرداروں کے دروازے کی طرف دیکھا۔

ایمان نمبردار کے بیٹے کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ گھر کے اندر جا کر ایمان کو لے آیا تھا اور اب دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے ہم دونوں کے وصل کے لمحات دیکھ کر محفوظ ہو رہا تھا۔

''راضی!'' ایمان آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آ کر رک گئی اور اس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔

''راضی یار! میں پاگل تھی، بے وقوف تھی جو انجانے میں تجھ سے دل لگا بیٹھی۔ میں تو محبت کو بہت آسان سمجھتی تھی لیکن جتنا درد میں نے اس محبت میں محسوس کیا ہے شاید ہی کسی اور نے محسوس کیا ہو، پھر بھی مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے معلوم ہے اس دنیا میں ہم دونوں کا ملن کبھی نہیں ہو سکتا لیکن قیامت والے دن میں خدا سے تجھ کو مانگ کر لوں گی۔''

''چلو ایمان! اب بس کرو۔۔۔۔ گھر چلو! اگر ابو اچانک آ گئے تو وہ ناراض ہوں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ بعد میں بھی تم دونوں کو ملا دوں، ابھی گھر چلو!'' نمبردار کے بیٹے نے ایمان کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر گھر کے اندر چلا گیا۔

میں نے ایمان کو دیکھ لیا تھا اس لیے چپ چاپ واپس گھر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد طارق بھائی اور تایا بھی خالی ہاتھ گھر واپس آ گئے۔ تھانیدار نے ان لوگوں سے پیسے تو سارے لے لیے تھے لیکن ابو کو گھر نہیں بھیجا تھا، انہوں نے آج رات تھانے میں ہی گزارنی تھی۔ دوسرا دن اور رات بھی ایسے ہی گزر گئی لیکن ابو گھر واپس نہیں آئے۔ دن ایک ایک کر کے گزر رہے تھے اور ہمارے ڈیرے پر موجود تمام جانور ایک ایک کر کے بِک رہے تھے۔

تھانے میں پولیس والے ابو کو مارتے بھی تھے اور ہمارے گھر والے پولیس والوں کی مار سے ابو کو بچانے کے لیے روزانہ پیسے دے رہے تھے۔ ابو کا کیس اب عدالت میں چلا گیا تھا جہاں ان پر اقدامِ قتل کا مقدمہ تھا اور اس کی ضمانت ملنا بھی بہت مشکل ہوتی ہے۔ ڈیرے پر موجود تمام جانور ابو کو باہر نکالنے کے چکر میں بِک گئے تھے لیکن پھر بھی ابو پچھلے دس دن سے تھانے میں بند تھے۔

گھر کے تمام افراد اب مجھ سے نفرت کرنے لگے تھے۔ وہ گھر کے سارے حالات کا ذمہ دار مجھے سمجھتے تھے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ آج میری وجہ سے پورے گاؤں میں ہم لوگوں کی عزت مٹی میں مل گئی تھی۔ میرے بھائی گھر سے باہر نکلتے تو گاؤں والے ان کو طعنے دیتے تھے۔

ہمسائیوں کے گھر سے لسی آئی تو امی نے اس میں تھوڑا نمک ملایا اور اس کے ساتھ ایک ایک روٹی بنا دی تھی۔ میں خاموشی سے روٹی کا نوالہ لسی میں بھگو بھگو کر کھانے لگا۔

''امی! ابو کب تک گھر آ جائیں گے؟'' عامر نے روٹی کھاتے کھاتے امی سے پوچھا تو امی نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا اور رونے لگ گئیں۔

''بیٹا! ہم لوگوں کو پتہ نہیں کس بندے کی نظر لگ گئی ہے، ہمارا پورا گھر کتنا خوش اور مطمئن تھا۔ کاش! میں سیالکوٹ اپنے بھائی کی شادی پر ہی نہ جاتی۔ یہ رضوان ادھر اپنے نانا کے گھر ہی رہتا تو ہمارا گھر کتنا مطمئن اور خوش ہوتا۔ شاید ہمیں اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔'' امی نے میری طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا تو میرے ہاتھ سے روٹی کا نوالہ گر گیا۔ میں نے کھانا وہیں چھوڑا اور اندر کمرے میں آ گیا۔

''واہ رے رضوان! کیا زندگی ہے تمہاری؟ تم اس دنیا میں آئے ہی کیوں ہو؟'' میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

واقعی! اس گھر کو میری ضرورت نہیں تھی۔ اگر میں ادھر سیالکوٹ میں ہی ہوتا تو میرے سارے گھر والے خوش تھے۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہی کافی تھے تو پھر میرے ہونے کا کیا فائدہ تھا؟ شاید میں بہت ہی فضول چیز ہوں، میری تو کسی کو بھی ضرورت نہیں تھی تو پھر میں زندہ ہی کیوں ہوں؟ جب کسی کو میری ضرورت نہیں ہے تو پھر اس زندگی کا کیا فائدہ جس سے پورا گاؤں ہی تنگ ہے؟

میرے سینے میں ایک بار پھر تیز درد ہونے لگا۔ میں نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور دبانے لگا لیکن درد بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ جب درد حد سے زیادہ بڑھ گیا تو میں چارپائی سے اٹھا اور زمین پر لیٹ گیا، لیکن درد کم ہونے کی بجائے اور زیادہ تیز ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی کسی تیز دھار آلے کے ساتھ میرے سینے کو اندر سے کاٹ رہا ہو۔ اگلے چار پانچ منٹ تک میں ایسے ہی زمین پر لوٹتا پوٹتا رہا اور پھر اچانک ہی میرے سینے کا درد ختم ہو گیا۔

میرا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ میں زمین سے اٹھ کر چار پائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ چار پائی پر بھی مجھے سکون نہیں مل رہا تھا۔ پھر میں کمرے میں لگی ہوئی کھڑکی کے پاس آیا اور وہاں سے باہر صحن میں دیکھنے لگا۔ جہاں ابھی تک عامر امی سے لپٹا ہوا تھا۔ میرے سارے بھائیوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میری وجہ سے آج ابو جیل میں تھے اور میرے سارے گھر کا سکون اجڑ چکا تھا۔ کبھی یہی گھر کسی جنت کی طرح لگتا تھا لیکن اب تو یہ دوزخ سے بھی برا ہو گیا تھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر دوسری طرف ہو گیا۔

کمرے کے ایک کونے میں کھیتوں میں ڈالنے والی دوائیاں اور سپرے وغیرہ پڑی ہوئی تھیں۔ میں ایسے ہی چلتے چلتے ان کے پاس چلا گیا۔ سامنے ہی گندم کو کیڑوں سے بچانے والی گولیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے گولیوں کی ڈبی کو اٹھا کر کھولا اور پاس ہی پڑی ہوئی کھیتوں میں ڈالنے والی ایک زہر کی بوتل بھی اٹھا لی اور دوبارہ کھڑکی کے پاس آ گیا۔ باہر چولہے کے پاس ابھی بھی سب بیٹھے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں کو لسی میں بھگو بھگو کر کھا رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے ان کی طرف دیکھا اور گندم میں ڈالنے والی گولیوں کی ڈبی کھول کر ساری گولیاں ہتھیلی پر رکھ لیں۔ زہر کی بوتل میں پہلے ہی کھول چکا تھا۔

''سوری ایمان! میں اس درد کو زیادہ نہیں برداشت کر سکا۔ تمہاری محبت کی تڑپ سے شاید موت زیادہ آسان ہے۔ یااللہ! میری باقی زندگی کے سارے سکھ اور خوشیاں میری ایمان کے نصیب میں لکھ دینا۔''

میں نے ساری گولیوں کو اپنے منہ میں ڈالا اور زہر کی بوتل کو منہ سے لگا کر گولیوں کو زہر کے ساتھ اپنے پیٹ میں اتارنے لگا۔ وہ زہر بہت زیادہ کڑوی تھی اور وہ میرے گلے کو چیرتے ہوئے میرے معدے میں آگ لگا رہی تھی۔ لیکن میں نے بوتل کو تب تک منہ سے لگائے رکھا جب تک اس کا آخری قطرہ میرے حلق سے نیچے نہیں اتر گیا۔ جب بوتل خالی ہو گئی تو میں نے اسے زمین پر پھینکا اور واپس چار پائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اگلے چار پانچ منٹ تک کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ صرف میرا گلا ہی کڑوا ہوا تھا۔

''شاید زہر جعلی ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا اور ایک بار پھر چار پائی سے اٹھ گیا اور کونے میں رکھی دوسری زہر کی بوتلوں کی طرف بڑھا لیکن تب تک زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اچانک میں چکرا کر زمین پر گر گیا اور میرے منہ سے جھاگ نکلنی شروع ہو گئی۔

کمرے میں ارم کسی کام سے آئی اور میرے منہ سے جھاگ نکلتے دیکھ کر اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور ذرا

سی دیر میں ہی میرے سارے گھر والے میرے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔طارق بھائی نے جلدی سے مجھے سیدھا کیا تو مجھے الٹیاں آنے لگیں۔امی نے عامر کو نمبردار کے گھر بھیج دیا تا کہ وہ گاڑی لے آئے۔

چونکہ اس وقت گاڑی صرف نمبرداروں کے پاس ہی تھی اس کے علاوہ پورے گاؤں میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ البتہ چار پانچ موٹر سائیکلیں ضرور تھیں۔اس لیے گاؤں میں کوئی بھی مسئلہ ہوتا تھا تو نمبردار کی گاڑی ہی کام آتی تھی۔ اگلے دس پندرہ منٹ تک نمبردار اپنے بیٹے کے ساتھ گاڑی لے کر آ گیا تو انہوں نے جلدی سے مجھے گاڑی میں ڈالا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔امی اور طارق بھائی بھی میرے ساتھ ہی اڈے پر آ گئے تھے۔

ہسپتال میں ڈاکٹر مجھے ایمرجنسی میں لے گئے اور میرا معدہ واش کرنے لگے۔ایک گھنٹے تک میں بالکل ٹھیک ہو کر ہسپتال کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔البتہ گلوکوز کی ایک بوتل میرے بازو میں لگی ہوئی تھی۔ یہ کمزوری دور کرنے کے لیے تھی۔ میں بروقت ہسپتال آ گیا تھا اور طارق بھائی کے سیدھا کرنے کی وجہ سے جو میں نے الٹیاں کر دی تھیں اس سے سارا زہر میرے معدے سے نکل گیا تھا اور میری جان بچ گئی تھی۔ میں ہسپتال میں آتے جاتے لوگوں کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔امی میرے تکیے کی طرف بیٹھی میرا سر دبا رہی تھیں۔

''باجی! یہ کچھ دوائیں ہیں، آپ صبح شام رضوان کو دودھ کے ساتھ دیتی رہنا۔ابھی کچھ کمزوری ہے لیکن دو تین دن تک یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' نمبردار میڈیکل سٹور سے کچھ دوائیں لے کر آ گیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں دوائیوں کا لفافہ تھا جو وہ امی کو پکڑا رہا تھا۔امی نمبردار کو دیکھ کر کھڑی ہو گئیں اور اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر رکھ لیا۔

''باجی! کوئی اور چیز چاہیے ہو تو بتا دینا میں لا کر دے دوں گا۔'' نمبردار امی سے نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔

ابو اور نمبردار کی بہت گہری دوستی تھی۔وہ بچپن کے دوست تھے۔امی جب اس گاؤں میں بیاہ کر آئی تھیں تو اسی نمبردار نے اسے اپنی چھوٹی بہن کہا تھا اور وہ امی کو اپنی چھوٹی بہن سمجھتا بھی تھا۔ایک ہی گاؤں کے ایک ہی بازار میں رہنے کے باوجود کبھی نمبردار ہمارے گھر خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔اگر کبھی وہ خالی ہاتھ آتا بھی، تو جاتے ہوئے امی کے ہاتھ پر کچھ رقم ضرور رکھ دیتا تھا۔

امی منع کرتی تھیں تو وہ لڑ پڑتا تھا، کہتا تھا کہ:

''بہنوں کا حق ہوتا ہے بھائیوں پر، بہنیں تو چھین کر لے لیتی ہیں اپنے بھائیوں کے ہاتھ سے اور میں کیسے خالی ہاتھ تیرے گھر چلا جاؤں۔''

امی بھی اس کا اپنے بڑے بھائیوں کی طرح خیال رکھتی تھیں لیکن میری اس محبت کی وجہ سے ان دونوں بہن بھائیوں کی محبت میں دراڑ آ گئی تھی۔

''بھائی جان!'' نمبر دار جانے لگا تو امی نے اسے آواز دی تو وہ رک کر پیچھے دیکھنے لگا۔

''جی باجی!'' وہ اب بھی امی کی آنکھوں میں دیکھنے سے کترا رہا تھا۔

''بھائی جان! مجھے نہیں معلوم گاؤں کے کیا حالات ہیں۔ میرے اس بیٹے نے پتہ نہیں کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ آپ اس گاؤں کے نمبر دار ہو اور اس گاؤں کو کیسے چلانا ہے وہ آپ بہتر جانتے ہو۔ لیکن میں ایک ماں ہوں اور اپنے بیٹے کو بچانے کو کوشش کر رہی ہوں۔ میرا شوہر پچھلے دس دن سے تھانے میں بند ہے لیکن پھر بھی ہم لوگ صبر کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے گھر کے سارے جانور بک گئے ہیں، گھر میں ایک روپیہ بھی نہیں ہے کھانے کے لیے۔ پچھلے تین دن سے میرے بچے ہمسائیوں کے گھر سے آنے والی کھٹی لسی میں روٹیاں بھگو بھگو کر کھا رہے ہیں لیکن میں پھر بھی صبر کر کے بیٹھی ہوئی ہوں۔ آج میرے بیٹے نے زہر کھایا ہے تو میں ڈر گئی ہوں! اگر یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا تو میرا بیٹا مر جائے گا۔ بھائی جان! آپ نے بیس سال سے مجھے اپنی بڑی بہن کہا ہے، آج یہی بڑی بہن آپ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہے۔ ہمیں معاف کر دو!'' امی نے اپنے سر سے دوپٹہ اتارا اور نمبر دار کے پاؤں میں رکھ دیا۔

''باجی! یہ کیا کر رہی ہو؟'' نمبر دار اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''بھائی جان! آج اپنی اس بڑی بہن کی خاطر میرے بیٹے کی زندگی بخش دو! میرے شوہر کو معاف کر دو۔ ہم لوگوں نے بہت تکلیفیں اٹھا لی ہیں، بس اب تو معاف کر دو!'' امی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور رونے لگ گئی۔

نمبر دار نے جلدی سے اپنے پاؤں میں پڑا ہوا دوپٹہ اٹھا کے امی کے سر پر رکھا اور اپنا ہاتھ امی کے سر پر رکھتے ہوئے گویا ہوا۔

''باجی! میں نے آپ کے بیٹے اور شوہر دونوں کو دل سے معاف کر دیا ہے۔ آج شام تک ریاض بھائی گھر آجائیں گے! یہ آپ سے آپ کے چھوٹے بھائی کا وعدہ ہے۔ آپ آرام سے اب گھر جاؤ اور ہو سکے تو مجھے بھی معاف کر دینا! میں گاؤں کا چوہدری تھا اور اسی چوہدراہٹ میں اپنی بہن کو بھول گیا تھا۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آج کے بعد میں آپ کے گھر کی ہمیشہ بھلائی ہی چاہوں گا۔'' نمبردار نے امی کے سر پر ہاتھ رکھا اور واپس چلا گیا۔

شام تک ڈاکٹر نے ہم کو ہسپتال سے فارغ کر دیا تھا اور ہم گھر آ گئے۔ اسی رات کو ابو بھی تھانے سے گھر واپس آ گئے۔ دوسرے دن کی صبح ہم نے ابو کے ساتھ ہی لسی سے روٹی کھائی تھی۔ ابو تھانے سے واپس تو آ گئے تھے لیکن ہمارے گھر کی ہر ایک چیز بِک چکی تھی۔ جب گھر کا سربراہ نہیں ہوتا تو گھر جنگل بن جاتا ہے۔ ہمارے ڈیرے پر اب ایک بھی جانور نہیں تھا۔ سبزی کے پودوں کو پچھلے دس دن سے پانی نہیں ملا تھا اور وہ سب خشک ہو گئے تھے۔

''چلو رضوان! ڈیرے پر چلتے ہیں۔'' ناشتہ ختم کر کے میں ابو کے ساتھ ڈیرے پر آ گیا۔

چار ایکڑ کا وہ چھوٹا سا قطعہ اراضی مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ جانوروں کے بغیر خالی ڈیرہ کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ ابو ڈیرے کی حالت دیکھ کر وہیں سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ یہی زمین ان کے اور ان کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی لیکن آج اس کی حالت دیکھ کر ان کا دل بھر آیا تھا۔ میں نے ڈیرے پر لگے ہوئے نلکے سے ایک گلاس پانی کا لیا اور ابو کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ان کو پانی پینے کا کہنے لگا۔

''ابو! پانی پی لو!'' میں نے پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھایا تو وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

''ابو پانی پی لو!'' میں ان کی آنکھوں میں زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔

''رضوان یار! کیا ہو گیا یہ؟ یہ ہمارے ڈیرے کو کس کی نظر لگ گئی یار! میری ساری زندگی کی کمائی یہی ڈیرہ تو تھا۔ کیسے پل بھر میں سب کچھ ختم ہو گیا؟ نہیں رضوان! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' ان پر غیر یقینی کی سی کیفیت طاری تھی اور غم کی شدت کی وجہ سے ان سے ٹھیک طریقے سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔

نمبردار نے گھر سے ابو کا پتہ کیا تھا لیکن ان کو گھر میں نہ پا کر وہ ڈیرے پر ہی آ گئے تھے۔ موٹر سائیکل پر نمبردار اور سرپنچ کو دیکھ کر ابو کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان دونوں کے لیے چارپائی سیدھی کی اور جب وہ چارپائیوں

پر بیٹھ گئے تو میں ان کے لیے گلاس میں پانی لے گیا۔

''ہاں ریاض بھائی! اب آگے کیا سوچا ہے؟'' نمبردار نے پانی کا گلاس زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں یار! زمین کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے تو اب کافی سارا پیسہ چاہیے۔ اگر تم اپنے ڈیرے پر کام کرنے کے لیے مجھے رکھ لو تو امید ہے میں پانچ چھ مہینوں تک پیسے اکٹھے کر کے زمین آباد کر لوں گا۔ میرے دونوں بیٹے بھی کام کرتے ہیں۔ خدا نے آزمائش میں ڈالا ہے تو جہاں اتنی زندگی سکھ میں گزاری ہے وہاں یہ مشکل کے بھی پانچ چھ مہینے نکل جائیں گے۔ آپ مہربانی کرو اور مجھے اپنے کھیتوں پر کام کرنے کے لیے نوکر رکھ لو۔'' ابو نے زمین پر لکیریں بناتے ہوئے کہا۔

''ابو! آپ رہنے دو، نمبردار کے کھیتوں پر میں کام کروں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا تو ابو میری طرف دیکھنے لگے۔

''نہیں بیٹا! یہ میرا کام ہے اور مجھے ہی کرنے دو! تم صرف محبت کرو، یہ زمین تو تم نے برباد کر ہی دی ہے! اب ہمارا گھر بھی برباد کر کے دیکھ لو۔''

''ابو! میں ایمان سے محبت کرتا ہوں اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ابو! یہ چیز میرے بس سے باہر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس گھر کی بربادی میں سارا میرا ہی ہاتھ ہے لیکن میں بھی کیا کروں؟ اگر میرے بس میں یہ چیزیں ہوتیں تو میں کبھی بھی ایمان سے محبت نہ کرتا۔'' میں ابو کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''نہیں بیٹا! انسان کے بس میں ہر چیز ہوتی ہے۔ انسان اگر کرنے پر آ جائے تو سمندروں کے سینے بھی چیر کر دکھا دیتا ہے، تو پھر یہ محبت۔۔۔۔ اس کو بھلا دینا کون سی بات ہے!'' ابو نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! جو چیز ممکن نہیں ہوتی ہے اس کی طلب کرنا بے وقوفی ہوتی ہے۔ ایمان شادی شدہ ہے، اسلم اس کا شوہر ہے۔ تم اور میں کیا ہمارا پورا گاؤں بھی زور لگا لے پھر بھی ہم لوگ ایمان کو حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ اسلم کی بیوی ہے اور تم کسی اور کی بیوی سے محبت کر کے گناہ کر رہے ہو۔ یہ گناہ ہے میرے بیٹے! محبت نہیں ہے۔ محبت تو پاکیزہ چیز ہوتی ہے اور تم دونوں پاکیزہ نہیں ہو! چھوڑ دو ایمان کو! اسے بھی جینے دو اور خود بھی جینے کی کوشش کرو۔'' میں خاموشی

سے ابو کے قدموں سے اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

نمبرداروں کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر نمبرداروں کے بیٹے پر پڑی تو میں اس کے پاس چلا گیا۔

''رضوان بھائی! ٹھیک تو ہونا؟'' اس نے میرا حال احوال پوچھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ایمان سے ملا دو یار!'' میں نے زمین پر نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''ایمان بہت یاد آ رہی ہے، ایک بار ملا دے یار!'' میرے الفاظ لڑکھڑا رہے تھے۔ ایمان کو ایک بار پھر دیکھنے کی حسرت دل میں سر اٹھا رہی تھی۔

''یار! ایک بار ایمان کا چہرہ دکھا دو، خدا تمہاری ہر مراد پوری کرے گا۔'' میں فقیروں کی طرح ہاتھ باندھتے ہوئے ایمان کے دیدار کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی اور دروازہ کھول کر گھر کے اندر چلا گیا۔

''راضی! کیسے ہو؟'' وہ ایمان کو لے کر آ گیا تھا۔

''ایمان!'' میں اس سے آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا اور خاموشی سے ایمان کو دیکھنے لگا۔

''راضی! اب کیسے ہو؟ تم نے اپنی جان لینے کی کوشش کیوں کی؟ دیکھ لو! میں بھی تو درد سے گزر رہی ہوں لیکن خودکشی تو نہیں کر رہی! تو پھر تم کیوں مرنے لگے تھے؟'' اس نے میرے گالوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور ایمان کے ہاتھوں کے لمس کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنے لگا۔

''راضی! کیسے ہو؟'' اس نے دوسری بار پوچھا تو میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

''ایمان! چلو اس گاؤں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ گاؤں کبھی بھی ہم لوگوں کو ملنے نہیں دے گا تو پھر ہم دونوں اس گاؤں کو چھوڑ ہی دیتے ہیں۔ چلو ایمان! ایک بار پھر بھاگ چلتے ہیں، چلو گی میرے ساتھ؟'' میں نے ایمان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

''راضی! ایمان نے اپنا سب کچھ تیرے نام کر دیا ہے تو پھر پوچھنا کیسا؟ جہاں کہو گے چپ چاپ چلوں گی،

کوئی سوال نہیں۔ جینا بھی تیرے ساتھ ہے اور مرنا بھی تیرے ساتھ ہے تو پھر سوال و جواب کیسا!''

''کہاں جاؤ گے تم دونوں؟'' نمبردار کے لڑکے نے سوال کیا تو میں نے سر کو نفی میں ہلا دیا۔

''پتہ نہیں! جہاں خدا لے جائے گا وہاں چلے جائیں گے۔ گاؤں میں تو ایک نہیں ہو سکتے شاید اس گاؤں سے باہر کوئی آسرا مل جائے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''پیسے ہیں تمہارے پاس کرایہ وغیرہ کے لیے؟'' اس نے پوچھا تو میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میری جیب میں اس وقت ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔

''ٹھہرو! میں گھر میں دیکھ کر آتا ہوں، ابو کے کچھ پیسے پڑے ہوئے ہوں گے۔'' وہ گھر کے اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد اس نے تین ہزار کے قریب روپے لاکر میری ہتھیلی پہ رکھ دیئے۔

''رضوان یار! گھر میں یہی پیسے پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تم دونوں ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے ہو اور مجھے تم دونوں کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔ کاش! میرے بس میں ہوتا تو میں تم دونوں کو ایک کر دیتا۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔''

میں نے اس سے پیسے لیے اور ایمان کو لے کر گاؤں سے باہر جانے لگا۔ وہ بڑی دیر تک ہم دونوں کو جاتا ہوا دیکھتا رہا اس کے بعد گھر چلا گیا۔ ہم دونوں بہاولپور شہر آ گئے اور وہاں سے میں نے سیالکوٹ جانے والی بس پکڑ لی۔

میں دوبارہ سیالکوٹ میں اپنے نانا کے گاؤں پناہ لینے کے لیے جانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ نانا اور نانی آج بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں اور وہ ہم دونوں کو اپنے گھر میں رکھ لیں گے۔ ساری رات کا سفر کر کے دوسرے دن صبح صبح ہم نانا کے گھر کے سامنے کھڑے ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ دروازہ نانا نے ہی کھولا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ نانی بھی ہم دونوں سے مل کر بہت خوش ہوئی۔

''بیٹا! تمہارے ابو نہیں آئے تمہارے ساتھ! وہ کدھر رہ گئے ہیں، ڈیرے پر تو نہیں رک گئے؟'' نانا ابو کا پوچھنے لگے۔ نانا کا ڈیرہ راستے میں ہی پڑتا تھا جہاں ماموں موجود ہوتے تھے۔ اس لیے وہ سمجھے شاید ابو ان کے ہاں ڈیرے پر رک گئے ہیں اور ہم دونوں کو گھر بھیج دیا ہے۔

''اور ہماری ارم بیٹی کا کیا حال ہے؟'' نانا نے ایمان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ نانا نے ارم کو صرف چار پانچ سال کی عمر میں ہی دیکھا تھا اس لیے وہ ایمان کو ارم سمجھ رہے تھے۔

''محبوب گھمن! ان کا ٹیلی فون ہے وہ جلدی سے آ کر اپنا فون سن لیں۔'' گاؤں کے لاؤڈ سپیکر میں اعلان ہوا تو نانا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اس وقت گاؤں کے ہر گھر میں ٹیلی فون نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ پورے گاؤں میں صرف ایک ہی ٹیلی فون ہوتا تھا۔ گاؤں میں جس کا بھی فون آتا تھا فون آپریٹر اس کا اعلان سپیکر میں کر دیتا تھا۔ جس کا فون ہوتا تھا وہ جا کر فون سن لیتا اور آپریٹر کو پانچ روپے دے دیتا تھا۔ اس کے علاوہ کہیں بھی فون کرنا ہوتا تو وہاں سے ہی فون ہوتا تھا۔ فون کے مختلف شہروں میں مختلف ریٹ ہوتے تھے جو کہ منٹ کے حساب سے چارج کئے جاتے تھے اور یہ عموماً تیس روپے سے لے کر ساٹھ روپے تک ہوتے تھے۔ بیرون ملک کال تو سو روپے سے بھی مہنگی ہوتی تھی۔

نانا نے چپل پہنی، پیسے لیے اور فون سننے کے لیے چلے گئے۔ آدھے گھنٹے بعد ہی ان کی واپسی ہو گئی۔ وہ ماموں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

''رضوان! یہ ارم نہیں ہے نا؟'' نانا نے غصے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ان کو ہمارے گھر سے ہی فون آیا تھا۔ ابو نے فون پر میرے گھر سے بھاگنے کا بتا دیا تھا۔ پورے گاؤں میں ایک بار پھر بھونچال آیا ہوا تھا۔ ایمان دوسری بار میرے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی اور اب کی بار پنچائیت والے ہم دونوں کو معاف نہیں کر رہے تھے۔ گاؤں میں ابو کو پکڑنے کے لیے پولیس آ گئی تھی لیکن اس بار نمبردار نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔ وہ وعدہ جو اس نے میری امی سے کیا تھا۔ وہ واقعی اب بھائی بن گیا تھا۔ اس نے پولیس کو روک دیا تھا اور لڑکی کو واپس کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ نانا نے ابو کو سب کچھ بتا دیا اور ہم دونوں کو ماموں کے ساتھ واپس بہاولپور بھیجنے کا وعدہ کیا۔

''تم اس لڑکی کو بھگا کر لائے ہو؟'' نانا نے ایک بار پھر پوچھا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''جی نانا! ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور گھر سے بھاگ آئے ہیں۔ میں نے اپنا بچپن اس گھر میں گزارا ہے اور مجھے امید ہے آپ لوگ مجھے اپنے گھر میں پناہ دے دو گے۔''

''ابرار! جلدی کپڑے بدلو، ہم دونوں اسی وقت ان کو لے کر واپس بہاولپور جا رہے ہیں۔'' نانا نے ماموں سے کہا تو وہ کپڑے بدلنے لگے۔

''نہیں نانا! ہم دونوں واپس نہیں جا رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے ہم کو پناہ نہیں دینی ہے تو نہ دیں، ہم دونوں چلے جائیں گے۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے، ہمیں کہیں نہ کہیں کوئی گھر مل ہی جائے گا۔ چلو ایمان!'' میں نے ایمان کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف جانے لگا تو نانا نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا۔

''تم کہیں نہیں جا رہے ہو! تم میرے ساتھ واپس بہاولپور جا رہے ہو۔''

''نانا! ہم دوسری بار گھر سے بھاگ رہے ہیں، وہ لوگ پکڑ کر ہم دونوں کو مار دیں گے اور ہم ابھی مرنا نہیں چاہتے۔'' میں نے غصے سے نانا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے پورے زور سے ایک تھپڑ میرے منہ پر مارا۔

''بیٹا جی! تم دونوں کو اپنی جان کی فکر ہو رہی ہے اور وہ جو تمہارے پیچھے تمہارے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں، ان کا کیا ہوگا، سوچا ہے؟ پولیس والے تمہارے گھر کے اندر ڈیرا ڈال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ تمہارے باپ اور تمہارے بھائیوں کو پکڑ کر لے جائیں گے اور پیچھے تمہاری ماں اور بہن ان دونوں عورتوں پر پنچائیت والے نظریں لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمہاری چھوٹی سی بہن ہے ارم، کبھی اس کا بھی سوچا ہے کہ اس کا کیا بنے گا؟ یہی گاؤں والے تمہاری اس چھوٹی سی بہن کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔ یہ کون سی محبت ہے جو بہنوں کی عزت لٹا کر حاصل کی جاتی ہے۔ اگر اتنی ہی محبت ہے تو گاؤں کے اس چوک میں دونوں لٹک کر مر جاؤ لیکن اپنے گھر کی عزت کی طرف کسی کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنے دو۔!''

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں راضی! ہم دونوں کو واپس ہی چلے جانا چاہیے۔ ہم دونوں اپنی محبت کے آگے خود غرض ہو گئے تھے۔ میں بھی ارم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ وہ میری چھوٹی بہن ہے اور میں اپنی اس محبت کے چکر میں اس چھوٹی سی لڑکی کی زندگی نہیں خراب کر سکتی۔ نہیں راضی! ہم دونوں کو واپس چلے جانا چاہیے۔ کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ مار دیں گے نا! تو مر جائیں گے، ابھی بھی کون سا زندہ ہیں۔'' ایمان نے مضبوط لہجے سے کہا تو میں نے سر ہلا دیا۔

''چلو نانا! چلتے ہیں۔'' میں نے نانا سے کہا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''رضوان پتر! تیرا نانا بوڑھا ضرور ہو گیا ہے لیکن ابھی بھی تیری اور تیرے گھر والوں کی حفاظت کر سکتا ہے۔ کسی میں بھی اتنی جرأت نہیں ہوگی جو تیری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لیں۔''

''ابرار! اپنے ساتھ اسلحہ بھی لے لینا!'' ماموں کپڑے پہن کر باہر آئے تو نانا نے ان سے کہا اور ماموں اندر کمرے میں اسلحہ لینے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہم تانگے میں بیٹھے واپس لاری اڈے کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں سے پھر آگے ہم نے بہاول پور والی بس پکڑنی تھی۔ اسی دن شام کو ہم واپس بہاولپور پہنچ گئے۔

گاؤں میں پنچائیت لگی ہوئی تھی لیکن چونکہ نمبردار اب ہماری طرفداری کر رہا تھا، نانا اور ماموں بھی ادھر اسلحے کی سرِ عام نمائش کر رہے تھے اور ہماری پوری برادری بھی ادھر اکٹھی ہوگئی تھی۔ اس لیے اس بار پنچائیت نے بھی زیادہ کچھ نہیں کیا۔ بس خاموشی سے ایمان کو اسلم کے حوالے کیا اور میں نانا اور ماموں کے ساتھ اپنے گھر آ گیا۔

چونکہ نانا اچانک بہاولپور آئے تھے اس لیے وہ زیادہ دن ہمارے پاس ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ اس لیے وہ اگلے ہی دن واپس چلے گئے۔ گھر والوں نے اب مجھ سے بات چیت کرنا بالکل بند کر دیا تھا۔ ابو بھی اب مجھ سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ نانا کے جانے کے دوسرے دن میں صبح صبح اٹھا اور خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

''رضوان! تم آج میری جگہ پر نمبرداروں کے کھیتوں پر چلے جاؤ۔ دوپہر کو آ جانا، اس کے بعد شام کو میں چلا جاؤں گا۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔''

''ابو نے مجھے کام پر جانے کا کہا تو میں خاموشی سے اُٹھا اور اندر جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ میں نمبرداروں کے کھیتوں پر جا کر کام کرنے لگا لیکن پتہ نہیں کیوں ایک بار پھر میرا دل گھبرانے لگا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا محسوس ہونے لگا تو میں نے کسی کو نیچے زمین پر رکھا اور خود بھی زمین پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا رضوان! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' نمبردار کے بیٹے نے میرے پاس آ کر پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں یار! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، پتہ نہیں کیوں مجھے ڈر سا لگ رہا ہے۔'' میں نے نحیف سی آواز میں کہا تو اس نے مجھے گھر جا کر آرام کرنے کا کہا۔

میں خاموشی سے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ابھی میں گھر کے دروازے پر ہی پہنچا تھا جب مجھے ایمان کی چیخنے کی آواز آئی۔اس کے ساتھ ہی گھر والوں کے چیخنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے بند تھا۔میں زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔شاید میں تھوڑی دیر اور دروازہ کھٹکھٹاتا تو کوئی کھول دیتا مگر مجھ سے صبر نہیں ہوا اور دروازے سے دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف صحن میں کود گیا۔میرے سارے گھر والے اندر برآمدے میں ایک کمرے کے دروازے کے گرد کھڑے شور مچا رہے تھے۔ایمان کے چیخنے کی آوازیں اندر سے آ رہی تھیں۔

''ایمان! کیا ہوا؟ کون ہے اندر؟ دیکھو میں آ گیا ہوں!'' میں نے گھر والوں کو ایک طرف دھکیلا اور کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

''ایمان! کون ہے اندر؟ دروازہ کھولو! میں آ گیا ہوں۔'' میں نے ایک جھٹکے سے دروازے کو کھولنا چاہا لیکن یہاں بھی دروازہ اندر سے بند تھا۔

چونکہ وہ لوہے کا دروازہ تھا جو کمرے کی دیوار میں مضبوطی سے لگا ہوا تھا اس لیے اسے کھولنا تقریباً ناممکن تھا۔اس دروازے کے علاوہ کمرے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

''راضی! راضی! مجھے بچا لو۔۔۔۔۔۔خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو!'' ایمان چلّا رہی تھی۔

''ایمان۔۔۔! ایمان۔۔۔! کون ہے اندر؟ کیا ہو رہا ہے؟'' میں غصے سے پاگل ہو گیا اور میں نے دروازے کو تین چار لاتیں ماری۔

دروازہ بہت مضبوط تھا اس لیے کھل نہیں سکتا تھا۔لیکن پھر بھی میں اسے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔اندر ایمان کی چیخوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔وہ منتیں کر رہی تھی۔۔۔رو رہی تھی لیکن اندر شاید کوئی طاقت ور آدمی تھا جو ایمان کی عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں دروازے پر لاتیں مارتا مارتا تھک گیا تو میں نے عامر کو گلے سے پکڑ لیا۔ہمارے گھر میں وہی سب سے چھوٹا تھا اور میرے ہاتھ میں صرف وہی آ سکتا تھا۔اس لیے میں نے اسے ہی گلے سے پکڑ لیا۔

''کون ہے اندر کمرے میں جو ایمان کی عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا ہے!'' میں نے غصے سے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

میرے چیخنے کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ سارے گھر والے ایمان کی چیخوں کو نظر انداز کر کے میری طرف متوجہ ہو گئے۔ عامر میرے ہاتھوں میں تڑپنے لگا۔

''کون ہے اندر ایمان کے ساتھ!'' میں نے دوبارہ چیختے ہوئے کہا تو امی نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا۔

''تمہارا باپ ہے اندر ایمان کے ساتھ! چھوڑ دو میرے بیٹے کو! کیوں اس بے چارے کی جان لینے پر تلے ہوئے ہو۔ اندر تمہارا باپ ہے جو اس عمر میں اس لڑکی کے ساتھ منہ کالا کر رہا ہے جسے وہ تین سال تک اپنی بیٹی کہتا آیا ہے۔'' امی نے ایک اور تھپڑ مجھے مارا اور عامر کو میرے ہاتھوں سے چھین کر اپنے گلے سے لگا لیا۔

میں ایک دم سے شاک میں چلا گیا۔ اندر ایمان کے ساتھ میرا سگا باپ زیادتی کر رہا تھا۔ ایمان کی چیخوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ وہ اندر کمرے میں ابو کے ساتھ گتھم گتھا تھی، وہ لڑ رہی تھی۔ ایک ننھی سی چڑیا بہت بڑے باز کے شکنجے میں پھنسی پھڑ پھڑا رہی تھی۔ میرے کانوں میں ابھی بھی ایمان کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں مگر میں ابو کے نام سے ہی شاک میں چلا گیا تھا۔

دل یقین نہیں کر رہا تھا مگر میری امی بھی سچ کہہ رہی تھیں۔ وہ میرا سگا باپ ہی تھا جس نے تین سال تک ایمان کو اپنی بیٹی کہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ میں ایمان سے محبت کرتا ہوں اور وہ ایمان کو اپنی بیٹی کی طرح چاہتے تھے۔ میں اس دنیا میں سب سے زیادہ اپنے باپ پر بھروسہ کرتا تھا۔ وہ ایک اچھے اور شریف ترین انسان تھے۔ جن کی کہی ہوئی ایک ایک بات میں دل کی گہرائیوں سے سنتا اور یقین کرتا تھا۔ آج وہی باپ بھیڑیا بنا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ دکھ اور درد کیا ہوگا کہ جس لڑکی سے آپ محبت کرتے ہوں اس لڑکی کی عزت آپ کا سگا باپ لوٹ رہا ہو۔

میں خاموشی سے اٹھا اور صحن میں چولہے کے پاس پڑی ہوئی سبزی کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اسے اپنی کلائی پر پھیر لیا۔ خون کا ایک فوارہ نکلا اور سیدھا میرے چہرے پر پڑا جو میرے چہرے کو سرخ کر گیا۔

''ہائے ریاض! تیرے بیٹے نے اپنی کلائی کاٹ لی ہے۔ ہائے ریاض! تم نے آج میرے بیٹے کو مار ڈالا۔''

امی کے چیخنے کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحے دروازہ ایک زوردار آواز سے کھلا اور مجھے ابو کا چہرہ نظر آیا۔ان کے پیچھے ہی ایمان کھڑی تھی۔ایمان نے ابو کو ایک طرف دھکا دیا اور بھاگتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

''راضی۔۔۔! راضی! کیا ہو گیا تم کو؟'' اسے اپنی تکلیف بھول گئی تھی۔میرے بازو اور چہرے کو خون سے رنگا ہوا دیکھ کر اسے اپنی برہنگی کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔

چونکہ سبزی کاٹنے والی چھری زیادہ تیز نہیں تھی اور ویسے بھی صرف ایک ہی کٹ لگا تھا۔طارق بھائی نے کپڑے کا ٹکڑا مضبوطی سے میری کلائی کے ساتھ باندھا تو خون نکلنا بند ہو گیا۔

''ایمان! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' میں اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی میرے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کی قمیض اوپر سے مکمل پھٹ گئی تھی جسے ابو نے اندر کمرے میں ہی اتار کر پھینک دیا تھا۔جب وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تو تب اسے اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔نیچے اس نے پھٹی ہوئی شلوار پہنی ہوئی تھی لیکن اوپر سے وہ مکمل برہنہ ہو گئی تھی۔ایمان نے اپنے دونوں بازوؤں کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔اس کی آنکھوں میں شرمندگی کے آثار دکھائی دے رہے تھے اور وہ اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔میں نے جلدی سے امی کے سر سے دوپٹہ کھینچ کر اتارا اور اسے ایمان کے اوپر ڈال دیا۔

ابو خاموشی سے اٹھے اور باہر کی طرف جانے لگے تو میں ابو کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''کدھر جا رہے ہو؟'' میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا تو وہ نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگے۔

''ڈیرے پر جا رہا ہوں۔''

''ایمان کے ساتھ زیادتی کیوں کی ہے؟ جانتے تھے نا آپ کہ میں ایمان سے محبت کرتا ہوں، اس گھر کی ہونے والی بہو ہے ایمان۔آپ کی بیٹی تھی ایمان، پھر بھی یہ سب کچھ کیوں کیا؟'' غصے کو کنٹرول کرنا میرے بس سے باہر ہو رہا تھا۔

''ہاں! کیوں کیا یہ سب کچھ؟'' میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

''سوری بیٹا! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے، مجھے معاف کر دینا!'' انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

کہا۔

میں نے ان کے ہاتھ کو جھٹک کر پرے کر دیا اور ان کا گریبان پکڑ لیا۔ میں نے تھپڑ مارنے کے لیے اپنے ہاتھ کو فضا میں بلند کیا لیکن اس سے پہلے ہی ایمان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں راضی نہیں! باپ ہے تمہارا، جو کچھ بھی ہوا ہے اسے بھول جاؤ اور ہو سکے تو معاف کر دینا ان کو! شاید ان کی بھی کوئی مجبوری ہو۔'' ایمان نے میرا ہاتھ چھوڑا اور اپنے گھر چلی گئی۔

ایمان ایک بار پھر نمبر داروں کے گھر منتقل ہو گئی تھی۔ دو تین دن تک میں ایمان سے ملنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ایمان نے ہر بار ہی مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میں نمبر داروں کے گھر میں زبردستی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

گھر میں ابو سے کوئی بھی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ خاموشی سے رات کو کام سے واپس آتے تو امی ان کو کھانا دے دیتی تھیں جسے وہ کھاتے اور سو جاتے۔ چار پانچ دن اسی طرح گزر گئے۔ ابو کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں میرے سینے میں آگ لگ جاتی تھی۔ ان کے کسی دوست نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ ایمان کو کمرے میں بند کر کے اس کپڑے وغیرہ پھاڑ دیں گے اور اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کریں گے تو پھر ایمان کبھی بھی آپ کے گھر میں بہو بن کر نہیں آئے گی۔ ایمان کے سر سے محبت کا بھوت اتر جائے گا اور وہ آپ سے اور آپ کے سارے گھر والوں سے نفرت کرنے لگے گی۔ اسی لیے ابو نے ایمان کے کپڑے پھاڑے تھے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔

ایمان مجھ سے محبت تو ضرور کرتی تھی لیکن اب وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم دونوں شاید کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتے۔ ابو کی اس حرکت کے بعد ہمارا پورا گھر کسی قبرستان کی طرح خاموش ہو گیا تھا۔ ہمارے گھر کا ہر فرد اکھڑا ہوا تھا۔

رات کو ابو دیر سے گھر آئے۔ امی نے حسبِ معمول ان کے آگے کھانا رکھا لیکن انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ امی نے خاموشی سے برتن اٹھائے اور سالن کو دیگچی میں واپس ڈال کر نلکے کے نیچے بیٹھ کر سالن کی کٹوری دھونے لگی۔ انہوں نے بھی ابو سے بات کرنی بالکل بند کر دی تھی۔

دوسرے دن صبح صبح ہم سب چولہے کے پاس بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ طارق بھائی کھانا کھا کر کام پر جانے لگے تو ابو نے انہیں روک لیا۔

’’آج کوئی بھی کام پر نہیں جائے گا! میں نے آج پنچائیت بلائی ہے، میں پنچائیت میں ایمان کی بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ ابو نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

’’رضوان!‘‘ میں ابو کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

’’رضوان یار! مجھے معلوم ہے شاید تم کبھی بھی مجھے معاف نہیں کرو گے لیکن یقین کرو میرے بیٹے! میں نے سب کچھ اپنے اس گھر کی بھلائی کے لیے کیا تھا۔ایمان کو آج بھی میں اپنی بیٹی ہی مانتا ہوں۔ جب تم دوسری بار گھر سے بھاگے تھے تو مجھے تمہارے ساتھ ساتھ ان سب کی فکر ہو گئی تھی۔ مجھے لگا شاید ایسے میں ایمان کے کپڑے پھاڑوں گا تو وہ مجھ سے اور اس گھر سے نفرت کرنے لگے گی۔شاید اس کے دل میں ہم لوگوں کے لیے محبت ختم ہو جاتی تو وہ تم سے بھی ناطہ توڑ لیتی۔لیکن نہیں، میرے بیٹے! میں غلط تھا۔ میں تم دونوں کو شاید سمجھ ہی نہیں سکا۔ میں اس محبت کو شاید سمجھ ہی نہیں سکا۔ مجھے معاف کر دینا! میں غلط تھا اور تم لوگوں کی محبت میں غلطی کر بیٹھا۔‘‘ ابو کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ رونے لگے۔

سارے گھر والے آ کر ابو سے لپٹ گئے اور انہوں نے ابو کو معاف کر دیا تھا لیکن میرا تو دل ٹوٹا تھا، میری تو ایمان مجھ سے دور ہو گئی تھی، میں کیسے ان کو معاف کر دیتا؟ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

’’نہیں ابو! میرا دل اتنا بڑا نہیں ہے۔ یہ سارے گھر والے آپ کو معاف کر رہے ہیں۔آپ ایک بار پھر ان کے ہیرو بن گئے ہیں لیکن میں نہیں۔شاید میں آپ کو کبھی معاف نہ کر سکوں۔سوری ابو! آپ میرے باپ ہو، میری رگوں میں آپ کا ہی خون گردش کر رہا ہے۔آپ نے مجھے سب کچھ دیا ہے لیکن وہ سب کچھ مل کر بھی ایمان کی کمی پوری نہیں کر سکتا۔آپ نے مجھ سے میری ایمان کو چھینا ہے۔ میں کیسے آپ کو معاف کر دوں؟ نہیں ابو! میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔‘‘ میں دوبارہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھانا کھانے لگا۔

میں اپنی زندگی میں اتنا رویا تھا کہ اب تو آنکھیں بھی پتھر ہو گئیں تھیں۔اس لیے اب آنکھوں میں آنسو نہیں آتے تھے۔اب میں اتنی جلدی روتا نہیں تھا۔

’’رضوان بیٹا! مجھے معلوم ہے تم مجھے کبھی معاف نہیں کرو گے۔لیکن میں تمہارا باپ ہوں، ہمیشہ تمہاری بھلائی ہی چاہوں گا۔ میں آج پنچائیت میں ایمان کی بات کروں گا۔ دعا کرنا! شاید خدا کوئی راہ نکال دے۔‘‘ میں نے

کھانے کا نوالہ واپس پلیٹ میں رکھا اور ابو کی طرف دیکھنے لگا۔

''ابو! کون سے خدا کی بات کر رہے ہو؟ کس خدا سے دعا مانگوں؟ اس خدا سے جو اوپر آسمانوں پر بیٹھا ہم دونوں کی محبت کا تماشہ دیکھ رہا ہے یا پھر اس خدا سے جو نمبرداروں کی اس چار دیواری کے اندر بیٹھا ہوا ہے؟ پتہ ہے ابو! آج جب ایمان پنچائیت میں آئے گی نا تو اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنا آپ۔ آپ کو خدا کی خدائی نظر آ جائے گی۔'' میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

باہر چوک میں لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اگلے آدھے گھنٹے تک ابو بھی اپنی برادری کے ساتھ چوک میں آ گئے اور پھر ایمان بھی آ گئی۔ میں نے ایک نظر ایمان کے چہرے پر ڈالی اور پھر ہٹانا بھول گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک میں ایمان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پیچھے سے گزرنے والے کسی لڑکے کا بازو مجھے لگا تو میں واپس اپنی دنیا میں آ گیا۔

''ہاں بھائی ریاض! بولو آپ کیا کہنا چاہتے ہو، آپ نے ہم سب لوگوں کو کیوں اکٹھا کیا ہے؟'' جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو سرپنچ نے ابو کو مخاطب ہو کر کہا۔

ابو سرپنچ کی آواز سن کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے نمبردار کا ہاتھ پکڑا اور نمبردار بھی ابو کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

''سرپنچ صاحب! سب سے پہلے میں اپنی اور بیٹے کی طرف سے آپ سے، اسلم سے اور پورے گاؤں والوں سے معافی مانگتا ہوں جس کی وجہ سے آپ لوگوں کو دکھ پہنچا ہے۔ آپ سب کو پتہ ہے کہ میرا بیٹا ایمان سے محبت کرتا ہے جبکہ ایمان شادی شدہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایمان اسلم کی بیوی ہے اور میرا بیٹا غلط کر رہا ہے، لیکن پھر بھی میں اپنے بیٹے اور ایمان کی خوشی کی خاطر ادھر کھڑا ہوں۔ ایمان اور رضوان دونوں ایک دوسرے محبت کرتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں کی آپس میں شادی کروا دوں۔ رہی ایمان کے شوہر اسلم کی بات، تو میں ایمان کے بدلے اس کو اپنی آدھی زمین دے دیتا ہوں۔ میرے پاس چار ایکڑ زمین ہے۔ اگر اسلم ایمان کو طلاق دے دے اور ایمان میرے بیٹے سے شادی کر لے تو میں دو ایکڑ زمین اسلم کو دے دوں گا۔ اس وقت دو ایکڑ زمین کی قیمت تقریباً چالیس لاکھ ہے۔ اسلم ایمان کو ۳۰ ہزار کے عوض خرید کر لایا تھا لیکن میں اپنی اس بیٹی کے لیے ۴۰ لاکھ دینے کو تیار ہوں۔''

میرے ابو نے بات ختم کی اور واپس چارپائی پر بیٹھ گئے۔

پورے گاؤں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ چوک میں اس وقت تقریباً دوسو سے زیادہ لوگ بیٹھے تھے لیکن کسی کی بھی آواز نہیں آرہی تھی۔ ۴۰ لاکھ بہت بڑی رقم تھی۔ ہمارے ہاں پنجاب میں زمین کو ماں کہا جاتا تھا اور جٹ اپنی زمین کے لیے مرجاتا مگر کبھی بھی اپنی زمین کسی کو نہیں دیتا تھا۔لیکن یہاں ابو صرف میری اور ایمان کی خوشیوں کے لیے اپنی چالیس لاکھ مالیت کی آدھی زمین اسلم کے نام پر لگانے کو تیار تھے۔

''ہاں بھئی اسلم! کیا کہتے ہو؟تم ایمان کو طلاق دے دو اور بدلے میں چالیس لاکھ مالیت کی دو ایکڑ زمین لے لو۔دونوں بچے محبت کے مارے ہوئے ہیں،ان کو ایک ہو لینے دو۔ان بچوں نے چھوٹی سی عمر میں بہت دکھ سہہ لیے ہیں،ان کو ملا دو یار! محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے،ان سے مت لڑو ورنہ خاک ہو جاؤ گے!'' نمبردار نے اسلم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

تقریباً پچپن سال کا وہ بوڑھا سا آدمی چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھ رہا تھا۔وہ ایک نظر ایمان اور دوسری نظر لوگوں پر ڈال رہا تھا۔میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھے تھے۔

''مجھے منظور نہیں ہے! میں اسلم سے طلاق نہیں لوں گی بلکہ اسلم کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہوں۔'' اسلم کے بولنے سے پہلے ہی ایمان اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''ایمان!'' میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا ایمان کے پاس پہنچ گیا۔

''ایمان! میرا باپ تجھ سے معافی مانگے گا۔پلیز ایمان! آج خدا ہم دونوں کو ملا رہا ہے تو ملنے دو!نہیں ایمان! بس ایک بار ہاں کر دو،اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے ایمان کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔وہ میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

''ایمان بیٹی! رضوان ٹھیک کہہ رہا ہے۔میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں،تم میری بیٹی کی جگہ ہو۔مجھ سے غلطی ہو گئی تھی مجھے معاف کر دو اور ہم لوگوں کے ساتھ ہمارے گھر چلو! میں ساری زندگی تم کو اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گا۔زمین کا کیا ہے وہ تو ہم محنت کریں گے اور دوبارہ خرید لیں گے،لیکن تمہارے جیسی بیٹی ہمیں کبھی بھی نہیں ملے گی۔'' ابو ایمان

کی منتیں کر رہے تھے لیکن ایمان ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''نہیں چاچا! اب نہیں، اب کی بار ایمان نہیں بِکے گی۔ کیا فرق ہے آپ میں اور اس اسلم میں؟ یہ تیس ہزار میں خرید کر لایا تھا اور آپ چالیس لاکھ میں خرید رہے ہو۔ بِک تو اب بھی رہی ہوں، ہاں! قیمت تھوڑی بڑھ گئی ہے۔ میں بکاؤ مال نہیں ہوں اور نہ ہی میری کوئی قیمت ہے۔ وہ بھی لونڈی خرید کر لایا تھا اور آپ بھی چالیس لاکھ میں اپنے بیٹے کے لیے غلام خرید رہے ہو!'' ایمان نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا تو ابو تڑپ اٹھے۔

''نہیں بیٹی! تم غلام نہیں ہو، تجھے اپنی بیٹی بنا کر اپنے گھر لے جاؤں گا اور ساری زندگی تجھے اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گا، بس ایک بار اپنے اس مجبور باپ کو معاف کر دو!'' ابو نے ایمان کے ہاتھ پکڑے تو ایمان نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

''نہیں چاچا! میں بہت چھوٹی ہوں، میرا دماغ بھی بہت چھوٹا ہے اور یہ دماغ آپ کو معاف نہیں کر رہا۔ شاید میں کبھی بھی آپ کو معاف نہ کر سکوں، اور جہاں تک زمین کا سوال ہے تو وہ آپ کے بیٹوں کی ہے، رضوان کی ہے۔ اور میں رضوان کی زمین کسی اور کو کیسے دے سکتی ہوں؟ اس زمین پر آپ کے بیٹوں کا حق ہے اور یہ زمین آپ کے بیٹوں کو ہی ملے گی۔'' ایمان پنچائیت سے واپس جانے لگی تو میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ایمان! میرا کیا قصور ہے؟ میرا کیا گناہ ہے جو تم ان سب کی سزا مجھے دے رہی ہو؟ میں تو آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور تم بھی تو مجھ سے محبت کرتی ہو۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو پھر آج یہ سزا میرے لیے ہی کیوں؟ آج جب سارا گاؤں ہماری محبت کا اعتراف کر رہا ہے تو پھر تم کیوں انکار کر رہی ہو؟'' میں نے ایمان کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ایمان! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔'' ایمان واپس پیچھے کو پلٹی اور میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

وہ کئی لمحوں تک میری آنکھوں میں گھورتی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کئی صدیاں گزر گئی ہوں لیکن یہ صرف چند لمحے ہی تھے۔

''رضوان! راضی! ایمان نے محبت کرنا چھوڑ دیا ہے۔ محبت ہم دونوں کو راس نہیں آتی، اس لیے اس ایمان نے محبت کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ چھوڑا اور بھاگتی ہوئی نمبرداروں کے گھر چلی گئی۔

ایمان کے انکار کے بعد اب پنچائیت کا کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

ایمان اس کے بعد دوبارہ میرے پاس نہیں آئی۔ اس نے ہمارے محلے کے ایک لڑکے سے دوستی کر لی تھی۔ اس لڑکے کی اڈے پر دکان تھی اور اس کی تیس سال کے قریب عمر تھی۔ ایمان رات کو چھپ چھپ کر اس کی بیٹھک میں جانے لگی۔ اسلم اب ایمان کو کچھ بھی نہیں کہتا تھا۔ اس لیے ایمان آزادانہ اس لڑکے کے پاس رات کو بھی چلی جاتی۔ محلے کے لڑکوں سے ہوتی ہوئی بات مجھ تک بھی پہنچ گئی۔ ایک رات میں نے چھپ کر ایمان کا پیچھا کیا تو وہ واقعی رات کو اس لڑکے سے ملنے کے لیے گئی تھی۔

ایمان نے شاید مجھے ری پلیس کر دیا تھا۔ اگلے دن میں نے ایک دوست سے پسٹل لیا اور اس لڑکے کی دکان پر چلا گیا۔ وہ دکان میں اکیلا ہی کاؤنٹر کی دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے بھری ہوئی پسٹل نکالی اور کاک کر کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ وہ لڑکا پسٹل دیکھ کر ڈر گیا تھا۔

''نوید! تم جانتے ہو کہ میں ایمان سے کتنا پیار کرتا ہوں؟ یہ پسٹل پڑی ہوئی ہے تمہارے کاؤنٹر پر! اسے اٹھاؤ اور مجھے گولی مار دو ورنہ میں تم کو گولی مار دوں گا۔''

''سوری رضوان بھائی! مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ مجھے معاف کر دو!'' وہ لڑکا پسٹل اٹھانے کی بجائے معافیاں مانگنے لگا تو میں نے پسٹل اٹھایا اور اسے واپس جیب میں ڈال لیا۔

''نوید! ایمان سے دور رہو! میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اگر آج کے بعد میں نے ایمان کو تمہاری بیٹھک میں دیکھ لیا تو خدا کی قسم تم کو بھی مار دوں گا اور خود بھی مر جاؤں گا۔ بس ایمان سے دور رہو!'' میں اس کی دکان سے باہر نکل آیا اور واپس گھر آ گیا۔

اس لڑکے نے ایمان سے دوستی ختم کر لی تھی لیکن ایمان شاید ایسے ہی اپنے آپ کو اذیت دے رہی تھی۔ پورا گاؤں پہلے ایمان اور میری محبت کی مثالیں دیتا تھا لیکن اب سب ایمان کو غلط لڑکی کہہ رہے تھے۔

ایمان نے اس کے بعد ایک اور لڑکے سے دوستی کر لی۔ اس سے پہلے کہ میں اس لڑکے کو ہٹاتا، ایمان نے دوسرے اور پھر تیسرے لڑکے سے دوستی کر لی۔ وہ سب لڑکوں سے ملتی تھی اور ان سے باتیں کرتی تھی۔ میں یہ سب

کچھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا تھا لیکن ایمان کو ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے آپ سے انتقام لے رہی تھی۔

دو تین مہینے اسی طرح گزر گئے۔ ایمان اب پورے گاؤں میں بدنام ہو گئی تھی۔ گاؤں کا ہر شخص اب ایمان سے نفرت کرنے لگا تھا اور مجھے سب ہی ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ جس لڑکی کے لیے میں نے اپنا گھر بار، ماں باپ اور بہن بھائی چھوڑ دیئے تھے، وہ لڑکی غلط نکل آئی تھی۔

گاؤں میں ہمارا اپنا ڈیرہ تھا اور ہم اپنا کاروبار کرتے تھے۔ اس ایمان کے لیے ہمارے سارے جانور اور فصلیں بک گئی اور نوبت یہاں تک آ گئی کہ میرا والد اور بھائی نمبردار کے کھیتوں میں کام کرنے لگے تھے۔ اب وہ خود کسی کے نوکر ہو گئے تھے۔ لیکن جس کے لیے یہ سب کچھ کیا وہی لڑکی اب تین تین لڑکوں سے دوستی لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اور میرے گھر والوں کو ان باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ ہم لوگوں کو ایمان پاک باز لگتی تھی۔ مجھے بھی ایمان بے وفا نہیں لگتی تھی۔

میں نہر کے کنارے پر بیٹھا ہوا چھوٹی چھوٹی کنکریاں پانی میں مار رہا تھا اور یہی اب میرا معمول بن گیا تھا۔ میں روزانہ صبح صبح نہر کے کنارے پر چلا جاتا اور کنارے پر لگے ہوئے درختوں میں سے کسی ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے سارا سارا دن ایسے ہی گزار دیتا تھا۔ رات کو جب اندھیرا چھا جاتا تو گھر چلا جاتا تھا۔ اگر گھر جانے میں تھوڑی دیر ہو جاتی تو گھر سے کوئی فرد آ جاتا اور مجھے اپنے ساتھ لے جاتا، زندگی ایسے جیسے رک سی گئی تھی۔

موٹر سائیکل پر نوید اڈے سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے نہر کے کنارے پر بیٹھے دیکھ کر اس نے موٹر سائیکل روکی اور میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''رضوان بھائی! آپ میرے پاس پسٹل لے کر آئے تھے اور مجھے مارنے کی دھمکی دی تھی۔''

''سوری نوید یار! میرا دماغ اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، مجھے معاف کر دینا!'' میں نے نوید سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

''نہیں رضوان بھائی! میں آپ سے معافی مانگنے کا نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے نا ایمان ہم تین لڑکوں سے رات کو ملتی ہے؟ ہم تینوں لڑکے ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں، تو ایمان ہم تین لڑکوں سے ہی کیوں ملتی

ہے؟ وہ باہر کسی اور سے کیوں نہیں ملتی۔ کبھی سوچا ہے رضوان بھائی!'' وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

''نہیں نوید یار! میرے پاس دماغ ہی نہیں ہے تو سوچوں گا کیسے؟ میرا دماغ صرف ایمان کو ہی سوچتا ہے، اس کے علاوہ مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔'' میں نے زمین پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''رضوان بھائی!'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کی ایمان آج بھی پہلے دن کی طرح پاکباز ہے، وہ بے وفا نہیں ہے۔ ہم تینوں دوستوں نے کبھی اس کے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ایمان ساری ساری رات ہمارے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھی رہتی ہے لیکن ہم میں سے کسی کی اتنی جرأت نہیں کہ اس کا ہاتھ بھی پکڑ سکیں، تو پھر کچھ غلط کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ بے وفا نہیں ہے۔ ایمان صرف آپ سے ہی محبت کرتی ہے اور اسی محبت کی خاطر ہی وہ بدنام ہو رہی ہے، تا کہ آپ اس کا خیال دل سے نکال کر اچھی زندگی گزار سکیں۔'' اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''نوید بھائی! کیا آپ میری ملاقات ایمان سے کروا سکتے ہو؟'' میں نے جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو اس نے حامی بھر لی اور گھر کی طرف چل پڑا۔

اس رات میں نے بھی جلدی سے کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ آدھی رات کو میں خاموشی سے اٹھا اور سیدھا نوید کی بیٹھک کی طرف چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہی تھا اور میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے چارپائی پر ایمان بیٹھی ہوئی تھی۔ ایمان مجھے اچانک دیکھ کر ایک لمحے کے لیے گھبرائی لیکن پھر نارمل ہوگئی۔

''چلو ایمان! گھر چلتے ہیں۔'' میں نے ایمان کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ نیچے زمین کی طرف ہی دیکھتی رہی۔

مجھے تین چار مہینے پہلے کا واقعہ یاد آ گیا جب ایسے ہی میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا تو ایمان نے بغیر کوئی سوال پوچھے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا تھا اور کہا تھا کہ؛

''راضی! محبت میں سوال نہیں پوچھے جاتے۔''

سوال تو آج بھی ایمان نے نہیں پوچھا تھا، بس جانے سے انکار کر دیا تھا۔

''ایمان! چھوڑ دو سب کچھ، چلو! گھر چلتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تم آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہو اور یہ سب کچھ صرف میری نفرت کے لیے کر رہی ہو۔ اپنے آپ کو بدنام کر رہی ہو تا کہ میں تم سے محبت کی بجائے نفرت کرنے لگوں۔ تم بدنامی کی بات کرتی ہو، خدا کی قسم! اگر تم اپنے ساری رات کے لیے اس نوید کے ساتھ سو بھی جاؤ تو پھر بھی یہ راضی تم سے اتنی ہی محبت کرے گا۔ تمہارے جسم سے محبت تو میں نے کبھی کی ہی نہیں ہے تو پھر یہ جھوٹ موٹ کی بدنامی کیسی؟ چلو! میرا پورا گھر تمہاری اسی طرح عزت کرے گا جیسے پہلے دن کرتا تھا۔ تم آج بھی ہمارے اس گھر کی ایک فرد ہو۔'' میں نے ایمان کی بہت منتیں کی لیکن اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ میں ناکام اور نامراد اپنے گھر کو واپس آ گیا۔

اس کے بعد ایمان کبھی بھی نوید یا دوسرے لڑکوں سے ملنے کے لیے رات کو نہیں گئی۔ نوید اور اس کے دوستوں نے مسجد کے اندر جا کر ایمان کی پاکبازی کی قسمیں اٹھائی تو گاؤں والوں کو بھی ایمان کی پاکدامنی کا یقین آ گیا تھا اور وہ پھر سے ایمان کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

گاؤں کا ہر فرد ہی میری اور ایمان کی محبت کی تعریفیں کرتا تھا۔ وہ سارے ایمان کو مجھ سے شادی کرنے کا کہتے تھے لیکن ایمان نہیں مانتی تھی۔ ابو نے اس کے کپڑے پھاڑ کر بہت بڑا ظلم کر دیا تھا۔ اس لیے وہ دوبارہ میرے گھر جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ ابو کے علاوہ میرے گھر کے سارے افراد ہی ایمان سے ملتے تھے اور ایمان ان سب سے خوش ہو کر ملتی تھی۔ ابو نے بھی تین چار بار ایمان سے ملنے اور اس سے معافی مانگنے کی کوشش کی لیکن ایمان نے انکار کر دیا۔

میں سارا سارا دن گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر بازار میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ ایمان سامنے والے گھر میں ہی رہتی تھی اور میں اس کے دروازے کی طرف ہی دیکھتا رہتا تھا۔

''راضی! آج رات بیٹھک میں ہی سو جانا، میں رات کو تمہارے پاس آؤں گی۔'' ایمان کوڑا پھینکنے کے لیے گھر سے باہر آئی اور مجھے کرسی پر بیٹھا ہوا دیکھ کر میرے پاس آ گئی۔

''جی اچھا!'' میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بس اتنا ہی کہا اور واپس اپنے گھر کی طرف جانے لگی۔

''اور ہاں راضی! پیسے کتنے ہیں تمہارے پاس؟'' اس نے پیچھے مڑ کر پوچھا تو میں جلدی سے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ میری جیب میں اس وقت صرف دس روپے تھے اور میں نے وہ نکال دیئے۔

''یہ دس روپے ہیں۔'' وہ دس روپے کا نوٹ دیکھ کر ہنس پڑی۔

''ایک ہزار روپیہ چاہیے مجھے! مل جائے گا؟''اس نے سوال کیا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ واپس اپنے گھر کو چلی گئی تو میں جلدی سے گھر میں ابو سے جا کر پیسے مانگنے لگا۔ابو کے پاس گھر میں اس وقت ۱۲ سو کے قریب پیسے تھے۔انہوں نے وہ سارے میری ہتھیلی پر لا کر رکھ دیئے۔

''بیٹا! مجھ سے غلطی ہو گئی تھی لیکن اس غلطی کی سزا میں اپنے بیٹے کو کھو کر نہیں بھگتنا چاہتا۔گھر سے مت بھاگنا تم دونوں! یہ دنیا اس گھر سے باہر بہت خراب ہے۔تم دونوں ابھی بچے ہو اور یہ دنیا تم دونوں کو کھا جائے گی۔بس اپنی محبت کو تھوڑا ٹائم دو، وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔صرف تین چار سال اور صبر کر لو اس کے بعد جہاں تم جانا چاہتے ہو میں خود تم کو چھوڑ کر آؤں گا۔ابھی مت بھاگنا! مجھے معلوم ہے اگر میں نے تم کو پیسے نہ دیئے تو تم کہیں اور سے بندوبست کر لو گے، بغیر پیسوں کے بھی بھاگ جاؤ گے۔اس لیے پیسے تو تم کو میں ضرور دوں گا۔لیکن اس بے چارے باپ کی بھی سن لو! صرف تھوڑا سا مزید ٹائم دے دو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے خاموشی سے ابو سے پیسے پکڑ کر جیب میں ڈال لیے۔

رات کو کھانا کھا کر باقی گھر والے تو اندر کمروں میں سو گئے لیکن میں بیٹھک میں آ کر لیٹ گیا۔ گھنٹے تک دروازہ کھلا اور ایمان اندر آ گئی۔اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لی اور میرے ساتھ ہی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس رات اس نے جی بھر کر باتیں کی۔اپنے بچپن کے دنوں کے واقعات جو اس نے گجرات میں گزارے اور یہاں بہاولپور میں گزارے۔ساری رات ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے، میں ایمان کی باتیں سنتا رہا۔اس کی میٹھی میٹھی باتیں میری پچھلی ساری زندگی کے زخموں کو مٹا رہی تھی، محبت پہلی بار مزا دے رہی تھی۔

''ایمان! کیا ہم یونہی اکٹھے نہیں رہ سکتے؟'' میں نے ایمان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''ایمان اب تو سارے گاؤں والے ہماری محبت کو سلام کرنے لگے ہیں۔تو پھر کون سی چیز تم کو میرے پاس آنے سے روک رہی ہے؟ چھوڑ دو سب کچھ! ہم دونوں پھر سے ایک بہتر زندگی جیئیں گے۔واپس آ جاؤ ایمان!'' ایمان نے میرے سینے سے سر اٹھایا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''راضی! تجھ سے محبت کرتے کرتے عشق کر بیٹھی ہوں اور یہی عشق مجھے تمہارے پاس آنے سے روک رہا

ہے۔ ہاں راضی! دل تو بہت کہتا ہے کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمہارے گھر چلی جاؤں لیکن نہیں! میں تمہاری زندگی کیوں برباد کروں۔ تمہارے باپ دادا کی زمین کیسے اس اسلم کے نام لگوا دوں۔ ابھی تو تمہارے گھر والے سبھی زمین دینے کے لیے تیار ہیں لیکن کچھ سالوں کے بعد یہی بھائی تمہارا گریبان پکڑ لیں گے۔ تمہارے باپ کی زمین پران کا بھی حق ہے اور اگر زمین چلی جائے گی تو پھر کھاؤ گے کہاں سے؟ میں اپنے ساتھ تمہاری بھی زندگی خراب نہیں کر سکتی۔'' وہ مجھے سمجھانے لگی۔

''راضی! مجھے تم سے عشق ہے اور یہی عشق تم سے دور چلے جانے کو کہتا ہے۔ میں تھک گئی ہوں، میں تمہارے گھر نہیں جا سکتی۔ ہاں راضی! تمہارے ساتھ چلتے چلتے اب تھک گئی ہوں اور اب کہیں دور چلے جانا چاہتی ہوں، تم سے دور چلی جانا چاہتی ہوں۔ یہی میرے لیے بھی بہتر ہے اور تمہارے لیے بھی۔ راضی! غلامی کی زندگی بہت بری زندگی ہے۔'' ایمان میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''راضی! میں نے اپنی زندگی کے یہ کچھ سال غلامی میں گزارے ہیں۔ یقین کرو کہ اس دنیا میں غلامی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہے۔ امریکہ نے دنیا سے غلامی کو ختم کر کے جنت بنا دیا ہے لیکن پاکستان میں اب بھی غلامی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ شاید خدا نے جنت امریکہ میں ہی کہیں بنائی ہو گی یا پھر شاید امریکہ میں کوئی اور ہی خدا بستا ہو گا۔ راضی! تم نے امریکہ کا مجسمۂ آزادی دیکھا ہے؟'' ایمان نے کھوئے کھوئے انداز سے پوچھا تو میں نے سر ہلا دیا۔

''ہاں ایمان! فلموں میں اکثر دیکھا ہوا ہے۔''

''راضی! وہی شاید دوسرا خدا ہے۔ وہ بہت دور ہے، اس دنیا کے دوسرے کنارے پر۔ میں ایک غلام لڑکی ہوں اس لیے وہاں تک نہیں جا سکتی لیکن تم تو جا سکتے ہو نا؟ زندگی امریکہ میں ہی ہے، تم وہاں چلے جاؤ اور ایک نئی زندگی کا آغاز وہاں سے جا کر کرو۔ امریکہ جاؤ گے نا میرے لیے؟ اس دوسرے خدا کے پاس چلے جانا اور اسے کہنا کہ پاکستان میں ایک غلام اور مجبور سی لڑکی صبح شام تیری پوجا کرتی ہے، تجھ سے محبت کرتی ہے اور تمہارے فراق میں گھل گھل کر مر رہی ہے۔'' ایمان باتیں کرتے کرتے رونے لگ گئی۔

''ایمان! میں تم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ ہم دونوں اپنی جنت اسی گاؤں میں بنائیں گے۔'' میں نے

ایمان کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''نہیں راضی! میں صبح چلی جاؤں گی۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس گاؤں کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ دو بار تمہارے ساتھ اس گاؤں کو چھوڑا تھا لیکن اب کی بار اکیلی جا رہی ہوں۔ میں تیرے اور تیرے گھر والوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میرا اس گاؤں سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔''

''نہیں ایمان! میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا، جہاں تم کہو گی ہم وہیں جائیں گے۔ میں تم کو لے کر امریکہ جاؤں گا اور ہم دونوں ہی امریکہ جائیں گے۔'' ایمان میری باتیں سن کر ایک دم ہنسنے لگی۔

''واہ راضی! امریکہ اتنا بھی نزدیک نہیں ہے۔ انسان کی ساری ہڈیاں ایک ہو جاتی ہیں اس امریکہ کو تلاش کرتے کرتے۔ یہ وہ خدا ہے جو ہر کسی کی قسمت میں نہیں ہوتا، لیکن تمہاری قسمت ہے۔ میں تمہاری بہتر زندگی کے لیے اپنی اس محبت کی قربانی دے رہی ہوں تو پھر تم بھی اس دوسرے خدا کو تلاش کر ہی لو گے!''

''ایمان! میرا خدا تو تم ہو، میں نے تو صرف تمہاری ہی خواہش کی ہے۔ میرا کوئی اور خدا نہیں ہے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''راضی! غلام کبھی خدا نہیں ہوتے، میں غلام ہوں اور یہی میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔''

میں ساری رات ایمان کی منتیں کرتا رہا لیکن اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہمارے گھر کے حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ اگر زمین بھی چلی جاتی تو پھر گھر میں فاقوں کی نوبت آ جاتی اور یہی ایمان کو منظور نہیں تھا۔ وہ مجھے ایک کامیاب انسان دیکھنا چاہتی تھی۔

اگلے دن صبح میں نے اس کے ہاتھ پر ۱۲ سو روپے رکھے اور اسے شہر جانے والی بس پر بٹھا دیا۔

''بس راضی! اب تم چلے جاؤ! آگے میں خود ہی چلی جاؤں گی۔'' میں ایمان کو بس کی سیٹ پر بٹھا کر خود بھی اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''ایمان! میں بہت محنت کروں گا۔ دو وقت کی روٹی تو کھلا ہی سکتا ہوں تم کو؟ پلیز! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔'' میں نے ایمان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں راضی! میں نے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو مجھے پیار سے جانے دو ورنہ کسی دن چوری چھپے بھی چلی جاؤں گی۔شاید خدا نے ہم دونوں کا ساتھ لکھا ہی نہیں تھا۔'' اس نے میرے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ایمان! تم اگر لازمی جانا ہی چاہتی ہو تو چلی جاؤ اور ہو سکے تو میرے والد کو معاف کر دینا! اسے تم اپنے باپ کی طرح سمجھتی تھی۔ وہ باپ تھا تمہارا اور اسی باپ نے تمہارے کپڑے پھاڑ کر تمہاری روح کو زخمی کر دیا تھا۔تم اور میں ہم دونوں ہی اپنے اس باپ سے نفرت کرتے ہیں۔غلطی تو کوئی بھی کر سکتا ہے، میرا باپ بھی غلطی کر بیٹھا تھا۔ ہو سکے تو اسے معاف کر دینا اور جب کبھی تم واپس آنا چاہو تو مجھے اپنا منتظر پاؤ گی۔ میں ساری زندگی تمہارا انتظار کروں گا۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوا، صرف تمہاری ایک آواز پر دوڑا چلا آؤں گا۔ میرے کان ہمیشہ تمہارے قدموں کی آہٹ سننے کے لیے بے چین رہیں گے۔ ساری زندگی جہاں بھی جس کے ساتھ بھی گزاروں مگر مرنا تمہاری بانہوں میں ہی چاہوں گا۔اس لیے لوٹ کر ضرور آنا! چاہے جتنی بھی صدیاں گزر جائیں۔آنکھیں تیرے دیدار کے لیے کھلی رہیں گی۔'' میں بس سے نیچے اترا اور گھر واپس آ گیا۔

ایمان اس کے بعد دوبارہ کبھی ہمارے گاؤں واپس نہیں آئی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔ میں گاؤں میں اکیلا رہ گیا تھا۔ابو سے میں بات تو کرتا تھا لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک عجیب سی جھجک ضرور ہوتی تھی۔ گھر میں اب کوئی بھی مجھ سے اونچی آواز میں بات نہیں کرتا تھا۔سب لوگ مجھ سے ہنسی مذاق کرتے اور مجھے واپس اپنی دنیا میں لانے کی کوشش کرتے لیکن میں نے ہنسنا اور خوش رہنا ویسے ہی چھوڑ دیا تھا۔بس جہاں پر ایک بار بیٹھتا تو پھر سارا سارا دن ادھر ہی بیٹھا رہتا۔گھر والوں نے مجھے واپس زندگی کی طرف لانے کے لیے بہت جتن کئے مگر ناکام رہے۔ بالآخر انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

''ابو! میں گجرات جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے صبح صبح ابو سے گجرات جانے کا کہا تو ابو مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔

''کیوں بیٹا! گجرات کیوں جانا چاہتے ہو؟'' ابو نے پوچھا تو میں نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

''ابو! میں ایک بار ایمان کے والد سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا ہوں جس شخص نے تیس ہزار کے عوض ایک ہیرے کو بیچ دیا تھا۔ابو! کیسا آدمی ہوگا وہ۔۔۔'' میں نے اپنے درد کو دل میں سموتے ہوئے کہا۔

''ایمان کی تھوڑی سی جھلک تو ہوگی اس شخص کے چہرے پر! میں وہی جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایمان بہت یاد آتی ہے ابو! میں ایمان کی صرف ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں زمین پر دیکھتے دیکھتے رونے لگ گیا۔

ابو نے طارق بھائی کو کچھ پیسے دیئے اور طارق بھائی مجھے لے کر گجرات آ گئے۔ اسلم کو ایمان کے آبائی گاؤں کا پتہ تھا اس لیے ہم اسلم کو بھی اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے۔ ایمان اس کی بیوی تھی اور وہ بوڑھا آدمی بھی ایمان کو دیکھنے کے لیے ترس رہا تھا۔

ہم نے رات کو بہاولپور سے بس پکڑی تھی اور اگلے دن صبح صبح ہم ایمان کے گاؤں پہنچ گئے۔ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے ہم ایک چار مرلہ گھر کے سامنے پہنچ گئے جس کی چھوٹی چھوٹی کچی دیواریں تھیں اور اندر بھی کچی چھت کا ایک کمرہ تھا۔ اس گھر کا بیرونی دروازہ نہیں تھا بلکہ کپڑے کا ایک بڑا سا پردہ لگا کر اس سے دروازے کا کام لیا گیا تھا۔ ایمان اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کی ننھی ننھی کلکاریاں اسی گھر میں گونجتی ہوں گی۔ اس کا بچپن اسی گھر کے آنگن میں کھیلتے ہوئے گزرا ہوگا۔

ہم نے پردے کو ہٹایا اور اندر چلے گئے۔ گھر کا اکلوتا کمرہ بھی دروازے سے محروم تھا اور گھر میں سامان نام کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ صحن میں ایک طرف چار اینٹیں رکھ کر ان سے چولہے کا کام لیا جاتا تھا۔ اس چولہے کے ساتھ ہی ایک کالی سیاہ ہنڈیا پڑی ہوئی تھی جس میں شاید تین چار دن پرانا باسی سالن پڑا ہوا تھا اور اس سالن کی بدبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔

گھر کے عین درمیان میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر ایک بوڑھا اور لاغر انسان بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ یہی ایمان کا باپ تھا۔ شاید وہ پچھلے دو مہینے سے نہایا نہیں تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر تھوڑا مسکرایا تو اس کے پیلے دانت نمایاں نظر آنے لگے۔

''آؤ آؤ چوہدری صاحب! بیٹھو بیٹھو! کیسے آئے ہو؟'' وہ ہمیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس مجہول سے بوڑھے کو گلے سے لگا لیا۔ ایمان اس چرسی بوڑھے کی بیٹی تھی اور ایمان کے جسم کی خوشبو اس کے جسم سے بھی آ رہی تھی۔ اگلے کئی لمحوں تک میں اس بوڑھے کے گلے سے لگا روتا رہا۔ جب روتے روتے میری آنکھیں خشک ہو گئیں تو طارق بھائی نے آگے بڑھ کر مجھے اس سے علیحدہ کیا۔ میں خاموشی سے

علیحدہ ہو کر کھڑا ہو گیا اور اسے دیکھنے لگا۔

''چاچا! آپ ایمان کے باپ ہو؟ ایمان آپ کی بیٹی ہے؟'' میں اس شخص سے پوچھنے لگا۔

''ہاں! ایمان میری بیٹی ہے۔ آپ لوگ ایمان کو کیسے جانتے ہو؟''

اس نے اسلم کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اسلم اس کے گاؤں کو جانتا تھا لیکن کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ کیسی رشتہ داری تھی کہ وہ شخص اپنے داماد کو بھی نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے تو ہمارے ہی گاؤں کے کسی اور شخص کے ہاتھ اپنی بیٹی فروخت کی تھی اور اسی شخص نے ایمان کی شادی اسلم سے کروا دی تھی۔

''چاچا! ایمان ہمارے ہی گاؤں شادی کر کے آئی تھی۔'' میں نے ایمان کے ابو کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا! ایمان ٹھیک تو ہے نا؟'' وہ بے قراری سے پوچھنے لگا۔

''چاچا! ایمان گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ وہ اب ہمارے گاؤں میں نہیں رہتی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے مایوسی سے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

''چلو طارق بھائی! واپس چلتے ہیں۔'' مجھ سے زیادہ دیر وہاں بیٹھا نہیں گیا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے چاچا! ہم چلتے ہیں۔'' میں نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''طارق! تھوڑے سے پیسے ایمان کے والد کو دے دو۔ غریب آدمی ہے، چار دن اس کے گھر کا کھانا چل جائے گا۔'' میں نے طارق بھائی سے کہا تو انہوں نے جیب سے دو سو روپے نکال کر اس کی جیب میں ڈال دیئے۔

''چاچا! ٹھیک ہے پھر، دعا کرنا شاید خدا میرے درد میں کچھ کمی کر دے۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور ہم لوگ اسی دن واپس بہاولپور آ گئے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے اور تین سال کا عرصہ بیت گیا۔ ارم سولہ سال کی ہو گئی تو اس کے لیے دوسرے گاؤں سے رشتہ آ گیا۔ وہ تیس سال کا ایک سانولا سا آدمی تھا اور اس کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ بیوی کے مرنے کے بعد وہ قریباً پانچ سال تک اکیلا رہا تھا۔ پھر ایک شادی کی تقریب میں اس نے ارم کو دیکھا، اسے ارم اچھی لگی اور اس نے رشتہ بھیج دیا۔

مٹھائیوں کے دس ٹوکرے اس دن ہمارے گھر کے صحن کے اندر رکھے تھے۔ اس کے علاوہ ایک خوبصورت سی سفید رنگ کی گائے بھی ہمارے گھر کے صحن میں کھڑی تھی۔ میں کام سے واپس گھر آیا اور گھر میں گائے کھڑی دیکھ کر خوش ہو گیا۔ تین سال کی سخت ترین محنت کے باوجود بھی ہم لوگ کوئی بڑا جانور نہیں خرید پائے تھے۔

ابو کو تھانے سے چھڑوانے کے لیے ہم نے جانور بیچنے کے لیے علاوہ بہت سارا قرضہ بھی لیا ہوا تھا۔ تھانے والوں نے ابو کو دس دن تھانے میں رکھ کر چھوڑ تو دیا تھا لیکن ان دس دنوں میں ہم لوگ کنگال ہو گئے تھے۔ اب تک ہم تینوں بھائی جو بھی کما کر لاتے تھے وہ قرضہ واپس کرنے کے چکر میں چلا جاتا تھا۔ تین سال بعد ہم نے قرضہ بھی واپس کر دیا تھا اور گھر میں سات آٹھ بکریاں بھی آ گئیں تھیں۔ ابو نے زمین پر سبزی اگانا شروع کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔

''امی! آپ لوگ گائے کب لے آئے خرید کر؟'' سامنے ابو بھی چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں آج بھی ابو کو بلانے سے گریز ہی کیا کرتا تھا۔

''رضوان بیٹے! ارم کا رشتہ آیا ہے ساتھ والے گاؤں سے۔۔۔۔ چوہدری احمد کا نام سنا ہے نا! اس کا اکلوتا بیٹا ہے حامد۔ تم جانتے ہو حامد کو! بہت شریف لڑکا ہے اور تیس ایکڑ زمین کا اکیلا مالک ہے۔ کوئی بھائی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بہن ہے۔ بہت ہی اچھی فیملی ہے اور ہماری ارم اس گھر میں جا کر بہت خوش ہوگی۔ یہ مٹھائی اور گائے انہوں نے ہی بھیجی ہے ارم کا رشتہ لینے کے لیے۔'' ابو نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''ابو! وہ تیس سال کا موٹا سا کالا آدمی ہے۔ جسے آپ لڑکا کہہ رہے ہو وہ شادی شدہ ہے، اس کی پہلے بھی ایک شادی ہو چکی ہے۔'' میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

''وہ شادی شدہ نہیں ہے! اس کی پہلی بیوی آج سے پانچ سال پہلے مر چکی ہے۔ اگر وہ ارم سے ۱۴ سال بڑا ہے تو کیا ہوا؟ بیٹا! مرد کی نہ ہی عمر دیکھی جاتی ہے اور نہ ہی رنگ۔ مرد صرف مرد ہوتا ہے اور اس کی کمائی اور شرافت دیکھی جاتی ہے۔ حامد شریف بھی ہے اور تیس ایکڑ کا مالک بھی ہے۔ اس کے علاوہ کون تمہاری اس بہن سے شادی کرے گا؟ وہ اگر اس کو پسند کرتا ہے تو اسے خوش بھی رکھے گا۔ گھر میں کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی نہیں ہے اور خواب محلوں کے شہزادوں کے دیکھ رہے ہیں۔''

''چلو طارق! گائے کو ڈیرے پر لے چلتے ہیں۔'' ابو نے طارق سے کہا۔

طارق بھائی نے گائے کی رسی پکڑی اور ابو کے ساتھ ڈیرے کی طرف چل پڑے۔انہوں نے ڈیرے پر گائے کو باندھا اور اس کے چارے وغیرہ کا انتظام کر کے گھر آ گئے۔

رات کو جب ارم مجھے کھانے کا پوچھنے آئی تو میں نے اسے روک لیا۔اسے چار پائی پر اپنے ساتھ بٹھایا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''ارم! خوش تو ہو نا اس شادی سے؟ شاید اگر میں ایمان سے محبت نہ کرتا تو ہمارے گھر کے حالات مختلف ہوتے اور تمہارے لیے کسی اچھے گھر سے رشتہ آتا۔میری محبت کی منحوسیت نے تمہارا بھی گھر برباد کر دیا ہے۔''

''نہیں بھائی! میں خوش ہوں، بہت خوش ہوں۔ابو ٹھیک کہتے ہیں کہ مرد کی کوئی عمر نہیں ہوتی، بس محبت اور عزت دینے والا شوہر ہو تو عورت کی ساری زندگی سکون سے گزر جاتی ہے۔عمر کوئی معنی نہیں رکھتی راضی بھائی! محبت معنی رکھتی ہے اور محبت ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتی۔آپ قسمت والے ہو، ہر کوئی آپ کی طرح بہادر اور محبت کرنے والا نہیں ہوتا۔'' ارم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ کمرے سے باہر جانے لگی لیکن پھر کچھ سوچتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکی اور ہلکی سی آواز میں مجھ سے کہنے لگی۔

''بھائی! ایمان آج بھی یاد آتی ہے نا آپ کو؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں ارم! آج بھی بہت یاد آتی ہے۔''

''بھائی! مجھے بھی ایمان کی بہت یاد آتی ہے۔دعا کرتی ہوں کہ ایمان جہاں بھی ہو جس کے ساتھ بھی ہو خوش ہو۔'' وہ واپس مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ایک مہینے کے اندر اندر ارم کی شادی ہو گئی اور وہ ہمارے گھر سے دوسرے گاؤں اپنے شوہر حامد کے گھر چلی گئی۔ان لوگوں نے چار گائیں اور دیں۔ابو منع کرتے رہے لیکن چوہدری احمد ناراض ہو گیا تو ابو نے وہ گائیں بھی رکھ لیں۔ہمارے گھر کے حالات اب ٹھیک ہو گئے تھے۔ارم بھی اپنے گھر میں خوش تھی۔

حامد واقعی ایک اچھا شوہر ثابت ہوا۔ وہ ایمان کو خوش رکھتا تھا، اس کی عزت بھی کرتا تھا اور محبت بھی بہت کرتا تھا۔ ارم کو خوش دیکھ کر مجھے بھی سکون ملنے لگا تھا۔ گاؤں میں رہتے رہتے میرا دل بھر گیا تو میں نے امریکہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ گھر میں صبح صبح سب لوگ ناشتہ کر رہے تھے جب میں نے روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

''ابو! میں امریکہ جانا چاہتا ہوں۔ آپ میرے امریکہ کے ویزے کا بندوبست کروا سکتے ہو تو کروا دو۔'' ابو نے میری باتوں کو سن کر روٹی چھوڑ دی۔

''بیٹا! پتہ بھی ہے نا امریکہ کہاں ہے؟''

''ہاں! مجھے پتہ ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ہنسنے لگے۔

''پینتیس چالیس لاکھ لگتے ہیں وہاں جانے کے لیے اور انسان کی ساری زندگی تباہ ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی امریکہ نہیں پہنچ پاتا۔ بیٹا! امریکہ اتنا ہی نزدیک ہوتا تو آج ساری دنیا ہی امریکہ میں بیٹھی ہوتی۔ خدا نے اسے دنیا کے دوسرے کنارے پر بنایا ہوا ہے اور درمیان میں بہت بڑا سمندر ہے۔ تم جتنا بھی زور لگا لو کبھی امریکہ نہیں جا سکتے۔

''لیکن ابو! میں نے امریکہ جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر امریکہ جا کر ہی رہوں گا۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا تو ابو بھی میرے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

انہوں نے مجھے بازو سے پکڑا اور اندر کمرے میں لے گئے۔ سوٹ کیس کھولا تو اس میں قریباً دس ہزار روپے تھے۔ انہوں نے وہ سارے پیسے میری ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

''میرے پاس یہی پیسے ہیں بیٹا! امریکہ کے لیے چالیس لاکھ لگتے ہیں اور میرے پاس تو چالیس ہزار بھی نہیں ہیں۔ اس لیے امریکہ کا خواب دیکھنا چھوڑ دو اور خاموشی سے گھر بیٹھو۔ امریکہ ہم جیسوں کے نصیب میں نہیں ہوتا۔'' میں نے ان پیسوں میں سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ اٹھایا اور اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''مجھے صرف پانچ سو ہی چاہیے ابو! میں آپ لوگوں کو امریکہ پہنچ کر دکھاؤں گا۔ ایمان کے خوابوں کی سرزمین کو میں اپنے سجدوں سے منور کروں گا۔ ایمان کا خواب اب میں پورا کروں گا۔'' میں صحن میں آیا، سب گھر والوں کے گلے مل کر ان سے معافی مانگی اور گھر سے باہر نکل گیا۔ گلی کراس کر کے میں اسلم کے گھر چلا گیا۔

''اسلم چاچا! میں امریکہ جا رہا ہوں، اس گھر کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں اب کب ملاقات ہوگی، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا! میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔'' اسلم نے مجھے گلے سے لگالیا اور رونے لگ گیا۔

''راضی! ہاں راضی! ایمان تم کو راضی ہی کہتی تھی نا! تو میں بھی تم کو راضی ہی کہوں گا۔تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ دونوں جوان تھے اور ایک دوسرے کی محبت میں عشق کی آخری حدوں کو بھی کراس کر گئے۔ پورا گاؤں آج بھی تم دونوں کی محبت کی قسمیں اٹھاتا ہے۔کبھی سوچا ہے راضی کہ یہ بوڑھا اسلم بھی ایمان سے محبت کر سکتا ہے؟ ہاں راضی! میں بھی ایمان سے محبت کرتا تھا اور شاید تم سے زیادہ ہی محبت کرتا تھا۔ چونکہ میں بوڑھا تھا، غریب تھا اور ایمان تم سے محبت کرتی تھی اس لیے میری محبت کی کوئی قیمت نہیں تھی۔لیکن محبت تو میں نے بھی کی تھی اور قیامت کے دن تم دونوں کی محبت کے درمیان ایک میں بھی ہوں گا۔خدا سے ایمان کی محبت تو میں بھی مانگوں گا اور دیکھوں گا پھر خدا کس کے نصیب میں ایمان کا ساتھ لکھتا ہے۔'' وہ رونے لگ گیا تو میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلّی اور اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

''اسلم چاچا! آپ خدا سے ایمان کو مانگنے کا کہہ رہے ہو؟ میں نے تو خدا سے مانگنا ہی چھوڑ دیا ہے۔آپ قیامت کی بات کر رہے ہو چاچا! یہی تو قیامت ہے۔ جب ایمان ہی نہیں ہے تو پھر جنت کیسی اور دوزخ کیسی؟'' میں نے اسلم سے معافی مانگی اور گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔

میں گاؤں سے نکل کر پیدل ہی اڈے کی طرف چل رہا تھا۔ مجھے پیدل چلتے ہوئے ابھی دس منٹ ہی ہوئے تھے جب پیچھے سے بس آ گئی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے بس کو روکا اور بس کے رکنے پر اس کی چھت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

بس مجھے لے کر شہر کی طرف چل پڑی۔ میں نے پیچھے مڑ کر اپنے گاؤں کی طرف دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بہاولپور کے اس ریگستانی گاؤں کو میں آخری بار دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی گاؤں تھا جس کے ایک ایک ذرّے سے ایمان کی محبت جھلکتی تھی۔ میں نے اس گاؤں میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ایمان کی محبت میں ڈوب کر گزارا تھا۔ یہی گاؤں جو کل تک میری اور ایمان کی محبت کا دشمن بنا ہوا تھا آج اس گاؤں کا ایک ایک فرد میری اور ایمان کی محبت کی مثالیں دیا کرتا تھا۔لیکن اب ایمان کے بغیر اس گاؤں میں رہنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

میرے والد اور بھائیوں کو بھی پتہ تھا کہ اگر میں اسی گاؤں میں ایمان کی یادوں کے ساتھ رہتا تو کسی دن شاید بالکل پاگل ہی ہو جاتا۔ اس لیے انہوں نے بھی مجھے جانے سے نہیں روکا تھا۔ میں ایمان کے خواب کو حقیقت میں بدلنے جا رہا تھا، میں امریکہ جا رہا تھا۔ ایمان کے اس خدا کی تلاش میں جا رہا تھا جو نیویارک کے ایک چھوٹے سے جزیرے پر ہاتھ میں کتاب اور شمع لیے ہوئے ہر آنے جانے والے کو سیدھا اور سچا راستہ دکھاتا تھا۔ جیب میں پانچ سو روپے کا نوٹ لیے میں دوسرے خدا کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔

''چلو بابو جی نیچے آ جاؤ! وہ سامنے کراچی جانے والی بس کھڑی ہوئی ہے۔'' کنڈیکٹر کی بھاری آواز آئی تو میں بس کی چھت سے نیچے اترا اور کراچی جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے سر کو بس کی سیٹ کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میں کراچی جا رہا تھا جہاں سے پھر میں آگے امریکہ کے لیے راستے تلاش کرتا، ایمان کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے میں ایک نئے اور انوکھے سفر پر چل پڑا تھا۔

میں ایران، ترکی اور یونان کے راستوں سے پیدل چلتا ہوا جرمنی پہنچ گیا تھا۔ اس سفر کی داستان بھی ضرور لکھوں گا۔ راستے کے ایک ایک دکھ اور درد کی داستان، سردی کی ٹھٹھرتی ہوئی کالی سیاہ راتوں کی داستان۔۔۔

پاکستان سے جرمنی تک کا سفر اگر میں یہاں لکھنا شروع کر دوں تو شاید میں اس انوکھے سفر سے انصاف نہ کر سکوں اس لیے میں اپنی کتاب کا یہیں پر اختتام کر رہا ہوں۔ دوسری کتاب میں کراچی سے آگے کا سفر لکھوں گا۔ ایمان کی محبت اس سفر میں ہر پل ہر جگہ میرے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ یہ محبت کا سفر ہے اور ایمان کی محبت ہی مجھے امریکہ تک لے کر جائے گی۔ ایک دن میں اس مجسمے کے سامنے کھڑا ہو کر اسے ایمان کی داستان سناؤں گا۔ محبت کی داستان۔۔۔ درد کی داستان۔۔۔ اذیت میں گزرے ہوئے ایک ایک پل کی داستان سناؤں گا۔

دس بارہ گھنٹے کا طویل سفر طے کر کے بس کراچی پہنچ گئی۔ میں خاموشی سے بس سے نیچے اترا اور کراچی شہر کی گلیوں میں بے مقصد گھومنے لگا۔ کرایہ وغیرہ نکال کر اب میری جیب میں صرف دو سو روپے بچے تھے اور میں دو سو روپے سے امریکہ جانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

ایمان کی دعا تھی کہ ایک دن میں امریکہ پہنچ جاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ خدا ایمان کی دعا کبھی رد نہیں کرے

گا۔ ایک خدا کی خواہش پوری کرنے کے لیے میں دوسرے خدا کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ ہم سب کا اصل خدا اوپر آسمان پر بیٹھا ہمیں درد سے تڑپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کامل عشق کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے دو لوگوں کی زندگیوں میں نئے راستے نئی منزلیں ڈال کر ان کی محبت کی آزمائش کر رہا تھا۔

To be continue......



دلچسپ اور منفرد واقعات پر مبنی ناول ہمیشہ سے انسان کے لئے بڑی کشش لیے ہوئے ہیں۔ سرزمینِ عرب کی الف لیلیٰ ہو یا ایران کی داستانِ امیر حمزہ (جس کا کچھ حصہ طلسم ہوشربا کے نام سے مشہور ہے) یا پھر ہندوستان کی بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتی جیسی کہانیاں، یہ سب انسان کے اسی شوق کو پورا کرتی نظر آتی ہیں۔

منفرد انداز میں عشق و محبت سے بھرپور اس ناول کے تخلیق کار رضوان علی گھمن ۲۰ مئی ۱۹۸۵ کو بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ SE کالج بہاولپور سے FSc کیا اور پھر یونان چلے گئے۔ تقریباً ۷ سال تک یونان میں رہے اور پھر جرمنی چلے گئے۔

پچھلے آٹھ سالوں میں ناول لکھنے کے علاوہ مقبول جرائد و رسائل میں بے شمار مضامین اور کالم لکھ چکے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جو درد، احساس، محبت اور رومانس پایا جاتا ہے، وہ انہی کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ بنیادی طور پر ایک ناول نگار ہیں اور ان کا پہلا ناول ''دوسرا خدا'' آپ کے سامنے ہے۔

ناول ''دوسرا خدا'' حیرت انگیز واقعات سے مزین، محبت کے ایک انوکھے اور دشوار گزار سفر کی دلچسپ اور طویل روداد ہے جس میں سسپنس اور مہم جوئی سے بھرپور واقعات کے علاوہ عشق و محبت کی رنگینی بھی موجود ہے۔ ۲۰۰ صفحات پر محیط، دلچسپ اور مفرد، ہمت اور شجاعت کی یہ طویل داستان یقیناً ہمارے قارئین کو بہت پسند آئے گی۔

ان کا یہ ناول آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اگر اس ناول کو آپ نے پسندیدگی کی سند بخشی تو انشااللہ! رضوان علی گھمن آپ کی حوصلہ افزائی اور تعاون سے مزید نئے خیالات و رجحانات کے ساتھ قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے جلد ہی دوسرا ناول پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ شکریہ